امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری

از جناب مولانا عبد الحلیم صاحب چشتی ایم اے، فاضل دیوبند

علامہ سید انور شاہ کے سوانح اور ان کے علمی کارناموں پر سب سے پہلے وقت کے نامور وسیع النظر عالم مولانا سید محمد یوسف بنوری زید مجدہم نے قلم اٹھایا اور عربی زبان میں علامہ موصوف کی سوانح عمری نفحة العنبر فی هدی الشیخ الانور کے نام سے لکھی جسے مجلس علمی ڈابھیل (سورت) نے ۱۳۵۵ھ میں شائع کیا تھا، اب یہ کمیاب ہے، اس میں موصوف نے علامہ سید انور شاہ کی زندگی کے بہت سے گوشوں سے بحث کی ہے۔

دوسری کتاب جس کا نام حیات انور ہے۔ ۱۹۵۵ء میں دیوبند سے شائع ہوئی تھی، یہ اردو زبان میں علامہ موصوف کے متعدد نامور تلامذہ کے گرانقدر مضامین کا مجموعہ ہے، جو اپنی افادیت، جامعیت اور تنوع کے اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے، بایں ہمہ سید انور شاہؒ کی جامع حیثیات شخصیت پر ابھی بہت کچھ لکھنے کی ضرورت ہے، اور اسی مقصد کے پیش نظر یہ مقالہ لکھا گیا تھا، جس کی اشاعت کی نوبت اب آرہی ہے۔

ہم نے اس مختصر مقالہ میں علامہ سید انور شاہ کے سوانح کے حصہ سے زیادہ تعرض نہیں کیا، یہ کام ان کے سعادت مند فرزندوں کے کرنے کا ہے، اور انھیں پہلی فرصت میں موصوف کی ایک جامع سوانح حیات مرتب کرنا چاہیے، اسی طرح ہم نے ان امور سے بھی زیادہ بحث نہیں کی ہے جن سے ان کے تلامذہ نے اعتنا کیا ہے، اس مختصر مقالہ میں ہم نے علامہ سید

انور شاہ کشمیری کی علمی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جن پر اس سے پہلے اس نوع پر بحث نہیں ہوسکی،

محمد انور نام اور انور شاہ عرف ہے، سلسلۂ نسب یہ ہے:-

محمد انور بن محمد معظم بن عبد الکبیر بن عبد الخالق بن محمد عارف بن حیدر بن علی بن عبد اللہ ابن مسعود النزوری الکشمیری الحنفی[1]۔

ولادت اور تعلیم و تربیت موصوف بوقت سحر بروز شنبہ ۲۷ شوال ۱۲۹۲ھ میں کشمیر جنت نظیر کی ایک چھوٹی سی بستی دودھوان (علاقہ لولاب) میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم و تربیت انکے والد ماجد محمد معظم شاہ نے کی، پانچ برس کی عمر میں موصوف کو قرآن مجید پڑھایا، پھر فارسی شروع کرائی، ۱۲۹۹ھ میں مولوی غلام محمد رسولی پورہ سے فارسی کے ساتھ عربی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھ لیں اور ضلع ہزارہ کے بعض علمائے سے تین برس تک درس نظامی کی کچھ درمیانی کتابیں پڑھیں۔

۱۳۱۰ھ میں مرکز علم دیوبند پہنچے، یہاں اساتذۂ وقت مولانا غلام رسول، حکیم محمد حسن وغیرہ سے درسی کتابیں جیسے حسامی، ہدایہ، تفسیر جلالین، تفسیر بیضاوی، قاضی مبارک، صدرا، تصریح، شرح چغمینی، نفیسی وغیرہ پڑھ کر ۱۳۱۴ھ میں مسندین وقت مولانا عبد العلی[2]، مولانا خلیل احمد انصاری

---

[1] ملاحظہ ہو نیل الفرقدین فی مسئلۃ رفع الیدین، شائع کردہ مجلس علمی ڈابھیل سورت ۱۳۵۰ھ ص ۱۴۵

[2] مولانا عبد العلی بن نصیب علی شیخ پوری میرٹھی۔ موصوف، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور فیض الحسن سہارنپوری کے تلمیذ، جید عالم اور دار العلوم دیوبند کے صف اول کے مدرسین میں سے تھے، مولانا عبد العلی نہایت سادہ، متواضع ملنسار، مہمان نواز اور خوشحال بزرگ تھے، جن ارباب کمال کو ان سے تلمذ کا شرف حاصل ہے ان میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ سید انور شاہ کشمیری اور مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہم اللہ کا نام سرفہرست ہے، (باقی حاشیہ ص ۱۴۴ پر)

محدث سہارنپوری اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی سے سند فراغ حاصل کی اور ۱۳۱۰ھ میں

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۳) افسوس ہے ان بزرگوں کی سوانحمریوں میں مولانا کا نام بار بار آیا ہے، مگر کسی نے ان کے حالات سے تعرض نہیں کیا، ہمیں موصوف کے متعلق جو معلومات مل سکی ہیں وہ ہدیۂ ناظرین ہیں

مولانا عبد العلی کا آبائی وطن شیخ پور تھا، یہ میرٹھ سے چھ میل کی مسافت پر ایک چھوٹی سی بستی ہے جو ان کے بزرگوں نے بسائی تھی۔

شیخ نصیب علی کے حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی سے بڑے گہرے تعلقات تھے، حضرت نانوتوی جس زمانہ (سنہ ۱۲۹۰ھ) میں مطبع ہاشمی میرٹھ میں کتابوں کی تصحیح کرتے تھے، جمعہ کا دن موصوف کا شیخ نصیب علی کے یہاں شیخ پور ہی میں گذرتا تھا، شیخ نصیب علی جمعرات کو شام میں بہلی پر بٹھا کر موصوف کو شیخ پور لاتے اور شب و روز حجۃ الاسلام کے فیوضات ظاہری و باطنی سے کسب فیض کرتے رہتے تھے، ان ہی ایام میں میرٹھ میں مولانا عبد العلی نے موصوف سے علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کی تھی، ان ہی نے حجۃ الاسلام سے یہ عرض کیا تھا کہ ان کی تقریر سے فن کی اعلیٰ سے اعلیٰ کتاب پانی ہو جاتی ہے لیکن اثنائے درس میں جب موصوف اپنی تحقیقات عالیہ پیش کرتے ہیں تو ہم ان کے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں، لہٰذا تقریر کا دائرہ نفس کتاب تک محدود رہنا چاہیے، ورنہ اسباق میں ہماری حاضری سودمند نہیں، حجۃ الاسلام نے ان کی حق گوئی کو پسند کیا اور ان کی وجہ سے درس میں نفس کتاب کے درس پر اکتفا کیا، مولانا مناظر احسن گیلانی فرماتے ہیں: "مشہور ہے اور اپنے متعدد دیوبندی اساتذہ سے یہ روایت میں نے سنی ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ جیسے خداداد ذکاوت کے مالک تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ عام مصنفین خصوصاً منطق و فلسفہ کی کوئی کتاب اگر آپ کسی کو پڑھانا شروع کرتے تو وہ بیچارہ بھی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا، کہتے ہیں کہ مولوی عبد العلی رحمۃ اللہ علیہ (صدر و شیخ الحدیث مدرسہ عبد الرب (حسین بخش) دہلی) شروع شروع جب مولانا کے پاس پڑھنے کے لیے حاضر ہوئے تو شاید صدرا یا شمس بازغہ فلسفہ کی کوئی کتاب شروع ہوئی، مولوی عبد العلی نے سبق

(باقی حاشیہ ص ۱۸۵ پر)

امام سنت مولانا رشید احمد گنگوہی سے بھی روایت حدیث کی اجازت لی ۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۴) کی عبارت ختم کی اور مولانا جھنجھلاتے ہوئے فرماتے کہ بس بس ختم کرو، میاں اس مسئلہ میں قاسم کی سن لو، پھر ان کی سمجھنا، مولوی عبد العلی صاحب نے یہ انداز جو درس کا دیکھا تین چار دن بعد وہ بے پاؤں گھر روانہ ہو گئے، مولانا کو ان کے چلے جانے کا افسوس ہوا، شاید ان کے گھر پہنچے اور بھاگنے کی وجہ دریافت کی، مولوی صاحب نے کہا کہ حضرت میں تو آپ سے کتاب پڑھنے گیا تھا، لیکن آپ تو بجائے کتاب کے قاسم کی سناتے ہیں، مولانا نے معاہدہ فرمایا کہ آئندہ ایسا نہ ہوگا، کتاب ہی پڑھاؤں گا، تب پھر واپس ہوئے۔ (ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، محبوب المطابع و جمال پرنٹنگ پریس دہلی، سنہ ۱۳۶۳ھ ج ۱ ص ۲۲۲)

دار العلوم دیوبند میں ان کے درس کا آغاز غالباً ۱۲۹۵ھ سے ہوا اور یہ سلسلہ ۱۳۱۱ھ تک قائم رہا، ۱۳۱۱ھ سے موصوف مدرسہ حسین بخش دہلی سے وابستہ ہو گئے، اور تا دم مرگ اسی مدرسہ میں قال اللہ اور قال الرسول کی مجلس گرم کرتے رہے، حکیم الامت نے ایک موقع پر موصوف سے اپنے تلمذ اور ان کے اخلاق و عادات کا تذکرہ حسن العزیز (جلد دوم حصہ سوم مکتبہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون بھارت سنہ ۱۳۸۶ھ ص ۹۴ و ۹۵) میں اس طرح کیا ہے۔

میں نے مولانا سے مقامات حریری، سبعہ معلقہ اور کچھ نسائی پڑھی ہے، مگر برتاؤ سے مولانا کے پتہ نہیں چل سکتا کہ استاد ہیں، چنانچہ جب میں دہلی سے چلتا ہوں تو کچھ نہ کچھ ہدیہ ضرور ساتھ کر دیتے ہیں، بے لوث اور بے تعلق ہیں کسی سے کچھ مطلب نہیں، خود بھی مدرسہ میں چندہ دیتے ہیں، مقدار چندہ کی سب سے زیادہ ہوتی ہے، ۱۵۰ روپیہ یا زیادہ تک، مولانا سے جو کوئی ملنے جاتا ہے، بہت خاطر کرتے ہیں، چائے، شربت پلاتے ہیں، دیوبند میں جب تشریف رکھتے تھے تو طلبہ کی خوب تادیب فرماتے تھے،

ایک مرتبہ ایک طالب علم نے سبق پڑھنے میں لیٹ کر پاؤں پیچھے کو پھیلائے، بس مولانا چلائے بدتمیز، بے ادب!

(باقی ص ۱۸۶ پر)

درس وتدریس کا مشغلہ

تحصیل علوم کے بعد موصوف نے درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا، چنانچہ ۱۳۱۵ھ میں جب مدرسہ امینیہ[1] کی دہلی میں بنیاد رکھی گئی تو صدر مدرس کے معزز عہدے پر موصوف ہی کا انتخاب عمل میں آیا، یہاں علامۂ موصوف نے کم وبیش ساڑھے چار سال تک علوم مروجہ کا درس دیا، اور ۱۳۲۰ھ میں جب ان کے بڑے بھائی کا وطن میں اچانک انتقال ہوگیا تو ان کے پدر بزرگوار مولانا محمد معظم شاہ نے خانقاہ میں جانشینی اور بعض خاندانی امور کی انجام دہی کے لیے وطن طلب کیا، اس حادثۂ جانکاہ کی وجہ سے موصوف کو وطن جانا پڑا اور پھر والدین نے کشمیر سے باہر رہنے کی اجازت نہ دی اور یوں چار و ناچار کچھ زمانہ وطن ہی میں گزرا۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۵) صرف اصلاح کی وجہ سے تنبیہ فرمائی، یہ نہیں کہ اپنا ادب کرایا۔ پھر فرمایا!

مولوی صاحب کے پاس بیٹھنے سے ایک خاص کیفیت معلوم ہوتی ہے، ہر شخص کے یہاں بیٹھنے سے جدا فرق معلوم ہوتا ہے کہ اسے تعبیر نہیں کر سکتے۔

خوبی ہمہ کرشمہ و ناز و خرام نیست ۔۔۔ بسیار شیوہ ہاست بتان را کہ نام نیست

مولانا عبد العلی کا انتقال دہلی میں ۱۳۴۴ھ کے بعد ہوا، اور مہندیوں کے قبرستان میں خانوادۂ ولی اللّٰہی کے پائیں میں سپرد خاک کیے گئے،

مولانا حکیم سید عبد الحی حسنی لکھنوی نے ۱۳۱۳ھ میں دہلی اور اس کے اطراف کا سفر کیا تھا، اس موقع پر وہ موصوف سے بھی ملے تھے، انھوں نے اپنی ملاقات کا حال اپنے روزنامچہ "دہلی اور اسکے اطراف" (شائع کردہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، دہلی ۱۹۵۸ء ص ۵۷ تا ۶۰) میں تفصیل سے کیا ہے۔

(حاشیہ ص ہذا) [1] مدرسہ امینیہ کے لیے ملاحظہ ہو:۔ (۱) واقعات دہلی از بشیر الدین احمد دہلوی، شمسی مشین پریس آگرہ ۱۳۳۷ھ ج ۲ ص ۳۰۰۔ (۲) مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ اسلامیہ شہر دہلی، شائع کردہ ادارۂ حفیظیہ مدرسہ امینیہ اسلامیہ دہلی ۱۳۷۷ھ

سفر حجاز اور واپسی کے بعد مدرسہ فیض عام کا قیام

۱۳۲۳ھ میں کشمیر سے حجاز گئے، فریضۂ حج ادا کیا، مصر و شام کے نامور محدثین سے روایت حدیث کی اجازت لی، حجاز کے کتب خانوں سے استفادہ کیا، سفر حج سے واپس آکر ۱۳۲۶ھ تک والدین کے پاس وطن میں رہے، پھر وطن سے باہر رہنے پر کسی نہ کسی طرح والدین کو راضی کر لیا اور ۱۳۲۶ھ میں خواجگان قصبہ بارہ مولا میں ایک مدرسہ فیض عام کے نام سے قائم کیا، اور سال بھر یہاں درس دیا، مگر بعض لوگوں کی بد معاملگی نے جلد ہی یہاں سے دل برداشتہ کر دیا جس کا اظہار موصوف نے اپنے ایک دیرینہ رفیق اور خواجہ تاش مولانا امین الدین بانی مدرسہ امینیہ المتوفی ۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء کے ایک مکتوب مورخہ ۲۷ جمادی الاولیٰ میں ان الفاظ میں کیا ہے،

"میں کوئی ایک مہینہ گذرا چاہتا ہے کہ مکان سے بعزم ہندوستان رخصت لیکر آگیا ہوں ہر چند کہ والدین تو راضی نہ تھے، مگر میرے الحاح پر اجازت دیدی، یہاں بارہ مولہ پہنچکر کچھ توقف سا ہو گیا، حقیر کو یہاں سے دل برداشتگی کا سبب یہ ہے کہ یہاں اگر مخلوق کی بد معاملگی کا زیادہ احساس ہوتا رہا، اتنا احساس مجھے ہندوستان میں نہیں ہوا، پھر اگر مجھے مخلوق کی طرف احتیاج مخالطت ہوتی تو لامحالہ یہ احساس کم ہوتا، مگر تجرد کے باعث یہ احساس کم نہیں۔" (ملتقطاً و مختصراً)[1]

علامۂ موصوف یہاں سے خاطر برداشتہ ہو کر ربیع الاول ۱۳۲۷ھ میں اپنے استاد شیخ زمن مولانا محمود الحسن دیوبندی کی خدمت میں پہنچے۔

عجیب حسن اتفاق ہے کہ شیخ الہند نے اسی ماہ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں دیوبند میں ایک تاریخی جلسہ کیا جس میں فضلائے دار العلوم کی دستار بندی کی گئی اور علامۂ موصوف کو بھی

[1] ملاحظہ ہو مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ اسلامیہ شہر دہلی، ص ۲۶۔

یہ سعادت حاصل ہوئی۔

دارالعلوم دیوبند میں تدریس کا آغاز

انہی ایام میں شیخ الہندؒ نے غالباً اس خیال سے کہ مدرسہ فیض عام میں طلبہ زیادہ نہیں اور نہ ان کی دلجمعی کا خاطر خواہ کوئی سامان ہے، ان کو زبردستی دارالعلوم دیوبند میں (جہاں تشنگانِ علوم کا تانتا بندھا ہوا تھا، ہندوستان کے کسی صوبہ یا شہر سے طلب علم کے لیے کوئی نکلتا تھا، وہ ادھر ہی کا رخ کرتا تھا، اور اتنا کچھ پاتا تھا کہ پھر دوسری طرف اس کا خیال تک نہ جاتا تھا) درس و تدریس کے فرائض انجام دینے پر مامور کردیا، انکو استاذالکل کے حکم کے آگے یارائے سخن نہ تھا، سرِ تسلیم خم کردیا، اس طرح دارالعلوم دیوبند میں سید انور شاہ کے درس کا آغاز ہوا، اور یہاں موصوف نے فن حدیث میں صحیح مسلم، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ جیسی امہات الکتب کا درس دیا، اور عرصۂ دراز تک کبھی اس خدمت کا معاوضہ نہیں لیا،

ازدواجی زندگی کا آغاز

علامہ موصوف اپنے غیر معمولی علمی شغف کی وجہ سے تجرد کی زندگی کو زیادہ پسند کرتے تھے، شیخ الہند نے سنتِ رسول کی ترغیب دی اور دارالعلوم کے اربابِ حل و عقد نے گنگوہ کے ایک معزز خاندان میں شادی کرادی، جب اولاد ذرا بڑی ہوگئی اور اخراجات کا سلسلہ بڑھا تو ارباب حل و عقد نے معاوضہ قبول کرنے پر بہت زور دیا، ان کے اصرار پر موصوف نے نہایت قلیل بقدر کفاف مشاہرہ قبول فرمایا،

شیخ الہند نے جب ۱۳۳۶ھ میں سفر حج کا ارادہ کیا تو اپنی جانشینی کے لیے مایۂ ناز تلامذہ میں سے جس جوہر قابل کا انتخاب کیا وہ سید انور شاہ ہی کی ذات ستودہ صفات تھی، جب علامۂ موصوف نے بحیثیت صدر مدرس جامع ترمذی اور صحیح بخاری کا درس دیا اور یہ سلسلہ ۱۳۴۵ھ تک جاری رہا، پھر بعض انتظامی امور میں اختلاف کی وجہ سے موصوف نے دارالعلوم

سے ترک تعلق کرلیا۔

دارالعلوم دیوبند میں شیخ الہند کے درس کا سلسلہ اگرچہ اس کے بام ترقی کا نیا پایہ تھا، لیکن علمی اعتبار سے سید انور شاہ کا زمانہ آخر المنازل تھا، اگر یہ اتفاقی واقعہ نہ پیش آجاتا تو دارالعلوم کو علامہ موصوف سے استفادہ کا کچھ اور موقع مل جاتا،

علامہ موصوف ذی الحجہ ۱۳۴۶ھ میں دیوبند سے ڈابھیل (سورت) تشریف لے گئے اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں حدیث کا درس دینا شروع کیا، ۱۳۵۱ھ تک یہاں قال اللہ اور قال الرسول کی مجلس گرم رہی، پھر طویل علالت کے بعد دیوبند میں ۲ر صفر ۱۳۵۲ھ کو آخر شب میں جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ

حافظہ

حق تعالیٰ شانہ نے موصوف کو عجیب و غریب صفات کا حامل بنایا تھا، حافظہ بلا کا ملا تھا، جو بات کبھی کان میں پڑ گئی وہ قید حافظہ سے پھر کبھی نہیں نکلی، اس کا اندازہ حسب ذیل واقعہ سے کیا جاسکتا ہے، فرماتے ہیں :-

"میں نے اپنے وطن کشمیر میں سنا تھا اور اس وقت میں چار برس کا تھا کہ دو آدمی اس مسئلہ میں گفتگو کر رہے تھے کہ عذاب بدن کو ہوتا ہے یا روح کو، آخر ان کی رائے یہ قرار پائی کہ عذاب دونوں کو ہوتا ہے، انھوں نے اس کی ایک مثال بھی دی، ایک نے کہا جسم اور روح کا ساتھ ایسا ہے جیسے ایک مرتبہ اندھے اور لولے کا ہوا تھا کہ وہ ایک باغ میں پھل توڑنے کے لیے گئے، اندھا پھلوں کے دیکھنے سے عاجز اور لولا ان کے توڑنے سے معذور، آخر ان دونوں نے باہم مشورہ کیا اور لولا اندھے کے کاندھے پر چڑھ بیٹھا، اندھا اس کو لیکر درختوں کی طرف چلا، لولا پھلوں کو دیکھتا اور ان کو توڑ لیتا۔

بس یہی حالت بدن کی روح کے ساتھ ہے، بدن بغیر روح کے جماد محض ہے جس کو حرکت نہیں اور روح بغیر بدن کے کچھ کرنے سے عاجز ہے، لہذا یہ ایک دوسرے کے محتاج ہیں، جب یہ دونوں کسب میں شریک ہیں، تو اجر و ثواب میں بھی دونوں شریک ہوں گے اور سزا و عذاب میں بھی ایک دوسرے کے شریک رہیں گے، پینتیس ۳۵ برس کے بعد میں نے یہ واقعہ علامہ قرطبی کے یہاں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ رضی اللہ عنہما سے مروی دیکھا اور بالکل ویسا ہی جیسا کہ ان دونوں نے کہا تھا، دیکھو کیا اس قسم کی باتیں ارسطو سے بھی ممکن ہیں[۵]؟"

شاہ صاحب کو فطرت کی طرف سے ایسا زبردست حافظہ عطا کیا گیا لیکن نیرنگیٔ قدرت کا تماشہ دیکھئے کہ موصوف کو قرآن مجید یاد نہ تھا، مولانا مناظر احسن گیلانی کا بیان ہے:-

"ان (شاہ صاحب) کا حافظہ غیر معمولی طور پر قوی تھا، اتنا قوی کہ لاکھوں میں شاید کسی ایک کا ہو، کم از کم اب تک اس قسم کے قوی حافظہ کے آدمی سے میری ملاقات نہیں ہوئی، ہزارہا ہزار اشعار عربی فارسی کے زبانی یاد تھے جس کتاب پر ایک نظر پڑ گئی، گویا ان کے حافظہ کے الماری میں بند ہو جاتی تھی، جب جی چاہتا اندر ہی اندر کھول کر پڑھ لیتے، لیکن اسی کے ساتھ قرآن کی کسی آیت کی ضرورت، اس قسم کے مواقع میں جیسا کہ مخدوم نے فرمایا، درس میں پیش آتی تو طلبہ کی طرف رخ کرکے دریافت فرماتے پوری آیت کیا ہے،

فقیر نے ایک دن عرض بھی کیا کہ آپ کا حافظہ تو قرآن کو شاید چند دنوں میں یاد کر سکتا تھا، پھر یہ کیا بات ہے!

جواب میں فرمایا کہ قسمت! بخت! واللہ اعلم کیا بات تھی[۶]۔"

---

[۵] ملاحظہ ہو فیض الباری علی صحیح البخاری، مطبعہ دار المامون قاہرہ ۱۳۵۷ھ ج ۴ ص ۱۱۵ [۶] ملاحظہ ہو ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، مطبع انتظامی حیدرآباد دکن ج ۲ ص ۱۰۳

وسعت معلومات و کثرت مطالعہ

تحصیل علوم سے فراغت کے بعد آغاز عمر ہی میں سید انور شاہؒ کا دائرہ معلومات اس قدر وسعت اختیار کر چکا تھا کہ اس عہد کے نامور علما جن کی وسعت معلومات اور کثرت مطالعہ پر ان کی تالیفات شاہد عدل ہیں، اپنی تحقیقات علامہ موصوف کے حضور پیش کرتے اور موصوف ان پر بیش بہا علمی فوائد کا اضافہ فرماتے، چنانچہ اس عہد کے نامور محدث شوق نیموی نے ۱۳۱۳ھ میں جب آثار السنن کی کتاب الصلوٰۃ مکمل کر لی تو اس زمانہ کے جن ارباب نظر اور اکابر اہل علم کو یہ کتاب بھیجی گئی، ان میں ایک صغیر السن محدث علامہ سید انور شاہؒ بھی تھے، لیکن ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں اس پر بیش بہا اضافہ کی سعادت جس کے حصہ میں آئی وہ صرف علامہ انور شاہ کی ذات ستودہ صفات تھی،

یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سید انور شاہ کی تحقیقات اور اضافہ معلومات کا دائرہ محدث نیموی کے مذاق تک محدود رہا ہے، موصوف نے متون احادیث اسناد، رجال اور جرح و تعدیل سے متعلق وہی تحقیقات پیش کی ہیں جو محدث نیموی کے مذاق کے مطابق تھیں، فقہ حدیث کی بحثیں، حقائق، معارف، اسرار بلاغت اور توجیہات حدیث سے بہت ہی کم اعتنا کیا، پھر بھی یہ اضافہ اصل سے دوگنا تگنا ہو گیا ہے[۱]، اور اسی افادۂ علمی کی وجہ سے موصوف نے نیل الفرقدین فی مسئلۃ رفع الیدین (ص ۵۶) میں یہ لکھا ہے "کنت مرافقاً فیہ" میں آثار السنن کی ترتیب و تدوین میں ان کا رفیق کار تھا، چنانچہ محدث نیموی کے فرزند کا بیان ہے:-

---

[۱] علامہ موصوف کے اس بیش بہا اضافہ کا نام "الاتحاف للاحناف" ہے، مجلس علمی جس کا قیام ہی علامہ سید انور شاہؒ کے علوم کی نشر و اشاعت ہے، اس نے شاہ صاحبؒ کے اس نادرۂ روزگار شاہکار کے اصل نسخہ کا

(باقی ص ۱۹۲ پر)

"تو قابل کہتا ہے ناظرین باتمکین معلوم فرمائیں کہ مولانا انورشاہ کشمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ تیرہ سو بارہ ہجری میں فارغ التحصیل ہوئے ہیں، جیسا کہ ان ہی کی شرح فیض الباری علی صحیح البخاری میں لکھا ہوا ہے، اور علامہ نیموی نے آثار السنن تیرہ سو چھ ہجری سے کچھ قبل ہی لکھنا شروع کیا اور تیرہ سو تیرہ ہجری میں آخر ابواب الصلوٰۃ تک تمام کر دیا، علامہ نیموی کا اوشحۃ الجید، حبل المتین رد السکین، تبیان تحقیق المعلی وغیرہ تالیف کرنا اور ان کا معجم طبرانی وغیرہ کا نشان و پتہ بتانا کہ فلاں فلاں کتب خانہ میں ہے، اور معرفۃ السنن بیہقی میرے کتب خانہ میں ہے، یہ سب مولانا انورشاہ کشمیری کے طالبعلمی کے زمانہ میں تھا، جبکہ وہ فارغ التحصیل بھی نہیں ہوئے تھے۔ لہذا مولانا انورشاہ نے جو نیل الفرقدین میں یہ لکھا ہے کہ انی کنت مرافقا فیہ اس سے مراد بعد اتمام آثار السنن قبل الطباعت ہے، مولانا شوق نیموی اپنی تحقیقات عجیبہ و فوائد غریبہ نادرہ جدیدہ دکھانے اور معلوم کرانے کے لیے تسویدات آثار السنن قبل طباعت بذریعہ ڈاک بھیجتے ہوں گے، جس طرح کہ اور بعض علماء کے پاس آثار السنن کو بھیجا ہے، مولانا انورشاہ کشمیری کو مولانا نیموی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، ان کے شاگرد حکیم مولوی محمد عیسیٰ مرحوم ساکن موضع جانا ضلع پٹنہ نے بندہ سے بیان کیا تھا کہ مولانا انورشاہ مدرسہ امینیہ دہلی میں کہتے تھے کہ ہم مولانا شوق نیموی سے جو تمہارے جوار کے ہیں، ملاقات کریں گے مگر چونکہ ۱۳۲۲ھ میں بروز جمعہ، ۱۷ رمضان شریف مولانا نیموی کا وصال ہو گیا، اس وجہ سے ملاقات نہ ہو سکی، خلاصہ یہ کہ آثار السنن جس کی آخر کتاب الصلوٰۃ سنہ تیرہ سو تیرہ ہجری میں تمام ہو گئی

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۱) کا محدود تعداد میں فوٹو کرا کر اسکو محفوظ کر لیا ہے، اور اب علامہ موصوف کے نامور فرزند سید محمد ازہر شاہ قیصر مدیر ماہنامہ دار العلوم نے اسکی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے، اللہ تعالیٰ جلد اس کام کو بخیر و خوبی پایۂ تکمیل کو پہنچائے۔ آمین

اور مولانا انورشاہ سنہ تیرہ سو بارہ ہجری میں کتب درسیہ مروجہ سے فارغ ہوئے، سنہ تیرہ سو بارہ ہجری کے بعد شوق نیموی ان کو بھی اپنی تحقیقات کہ جن سے کتب محدثین خالی ہیں دکھانے کیلئے اجزاء آثار السنن بذریعہ ڈاک بھیجتے ہوں گے اور علامہ کشمیری کچھ رائے و مشورہ دیتے ہوں گے واللہ اعلم۔ اس اعتبار سے من نوع مرافقت کہی جا سکتی ہے، جو کہ بعد اصل تالیف و اتمام کے ہے، نہ کہ وقت تالیف کیونکہ اس وقت تو مولانا انورشاہ محض طالب العلم تھے،[1] فافہم۔"[2]

تبحر علمی ضبط و اتقان، ذکاوت و ذہانت، فہم و فراست، دقت نظر، حدت فکر، وسعت مطالعہ کثرت معلومات، استحضار علوم اور تبحر میں اپنی نظیر آپ ہی تھے، صرف و نحو، معانی و بیان، شعر و ادب، منطق و فلسفہ، لغت، فقہ، اصول فقہ، کلام، تصوف، تاریخ، رجال، طبقات تفسیر، حدیث اور اصول حدیث، غرض ہر فن میں مجتہدانہ بصیرت رکھتے تھے، اور عربی و فارسی نظم و نثر پر یکساں قادر تھے، ایسی جامعیت اور ہر فن میں ناقدانہ مہارت کی وجہ سے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی موصوف کو علوم میں ان کے اساتذہ سے بھی فائق سمجھتے تھے، وہ فرماتے تھے:-

"مولانا انورشاہ صاحب بہت بڑے متبحر عالم تھے، یہاں تک کہ ہے تو گستاخی لیکن سچی بات کو کیوں چھپاؤں، میرا یہ خیال ہے کہ وہ اپنے اکثر اساتذہ سے بھی علوم میں بڑھ گئے تھے۔"[3]

حفظ حدیث علامہ سید انورشاہ بلاشبہ حفاظ حدیث میں سے تھے، حفظ حدیث کی حقیقت سمجھنے

---

[1] شاہ صاحب کو اپنے زمانہ طالب علمی ہی میں ہندوستان کے ایک نامور وسیع النظر محدث کے اہم علمی کارنامہ پر اضافہ کی سعادت اگر حاصل ہو گئی تھی تو یہ شاہ صاحب کی وسعت نظر کی اور بھی زیادہ قوی دلیل ہے۔

[2] ملاحظہ ہو القول الحسن فی الرد علی ابکار المنن وفی تائید آثار السنن از ابن نیموی اصح المطابع آسی پریس لکھنؤ ۱۹۶۳ء ج ۱ ص ۱۹

[3] ملاحظہ ہو الافاضات الیومیہ من الافادات القومیہ (ملفوظات حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی) اشرف المطابع تھانہ بھون ۱۹۴۱ء ج ۷، ص ۱۱۱

کے لیے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ محدثین کی اصطلاح میں حفظ حدیث سے مراد استحضار اور تذکر نہیں ہے یعنی احادیث کا نوک زبان پر ہونا بلکہ معرفت یعنی ملکۂ فن مراد ہے اور حقیقت میں یہی معیار حفظ ہے، اور متاخرین ائمۂ فن کے یہاں اسی کا اعتبار ہے، اسی معیار پر متاخرین حفاظ میں سے حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنے اکابر شیوخ کو جانچا اور پرکھا ہے، موصوف انباء الغمر انباء الغمر میں حافظ زین الدین عبد الرحیم عراقی المتوفی ۸۰۶ھ اور ان کے تلمیذ رشید حافظ نور الدین علی ہیثمی المتوفی ۸۰۷ھ میں موازنہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

لم نرفی هذا الفن اتقن منه وعليه [1]	ہم نے فن حدیث میں حافظ عراقی سے زیادہ متقن
تخرج غالب اهل عصره ومن اخصهم به	و پختہ نہیں دیکھا، اس زمانہ کے اکثر اہل علم نے
صهره شيخنا نور الدين الهيثمي وهو	ان ہی سے کسب کمال کیا ہے، اور ان کے
الذی دربه وعلمه کیفیة التخریج	تلامذہ میں سب سے ممتاز ان کے داماد ہمارے
والتصنیف وهو الذی یعمل له	شیخ نور الدین ہیثمی ہیں، شیخ عراقی نے انھیں
خطب کتبه ویشهد له وصار	پڑھایا، تصنیف اور تخریج احادیث کا ڈھنگ
الهیثمی لشدة ممارسته اکثر	بتایا تھا، وہ انکی کتابوں پر دیباچے لکھتے اور
استحضار اللمتون من شیخه	انکی نسبت بھی حافظ ہیثمی کی طرف کرتے تھے،
حتی یظن من لاخبرة له انه	ہیثمی کو فراولت اور کثرت مشق کی وجہ سے
احفظ منه ولیس کذالک لان	احادیث کے متون اپنے شیخ عراقی سے زیادہ
الحفظ المعرفة [1]	یاد ہو گئے تھے یہاں تک کہ جس کو حقیقت حال

نہ معلوم ہو وہ یہی خیال کرتا تھا کہ شیخ سے ہیثمی زیادہ حافظ ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ حفظ تو معرفت کا نام ہے۔

[1] ملاحظہ ہو انباء الغمر بحوالہ فہرس الفہارس و معجم المعاجم والمشیخات والمسلسلات از حافظ سید عبد الحی الکتانی المتوفی ۱۳۸۳ھ طبع فاس ۱۳۴۶ھ ج ۲ ص ۱۹۷ و ۱۹۸ و شذرات الذہب فی اخبار من ذہب از ابن العماد حنبلی مکتبۃ القدسی مصر ۱۳۵۱ھ ج ۷ ص ۵۶۔ و ذیل طبقات الحفاظ للذہبی از حافظ جلال الدین سیوطی طبع دمشق ص ۳۷۳ و البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع از قاضی محمد شوکانی طبع قاہرہ ۱۳۴۸ھ ج ۱ ص ۴۴۲

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حفظ حدیث کے لیے حافظ میں ملکۂ فن کا پایا جانا کافی ہے، استحضار و تذکر شرط نہیں ہے، چنانچہ شیخ ہیثمی صاحب مجمع الزوائد اور شیخ زین الدین عراقی صاحب الالفیہ کے بارے میں حافظ ابن حجر کا یہ لکھنا کہ ہیثمی فی الفور حدیث کی تخریج کرتے اور بتا دیتے تھے، اس بنا پر پڑھے لکھے لوگ ان کو بڑا حافظ سمجھتے تھے، حالانکہ نور الدین ہیثمی نے شیخ عراقی ہی سے سب کچھ سیکھا تھا، اور شیخ عراقی کو فن کا ملکہ تھا، گو فی الفور حدیثوں کی تخریج سے قاصر تھے، یہ بات علامہ سید انور شاہ کو بھی حاصل تھی، اسی لیے ہم نے ان کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے، انکی متون احادیث پر نہایت غائر نظر تھی، وہ علل اسانید سے واقف تھے، مراتب رجال کا انھیں علم تھا، وہ صحیح و سقیم کو سمجھتے تھے، اور فن جرح و تعدیل اور وفیات کے ماہر تھے، راویوں کا تشابہ رفع کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اور ان فنون میں ان کو بڑا اتقان و رسوخ حاصل تھا، ان کے رسائل اور امالی آج بھی اس امر پر شاہد عدل ہیں،

فقہ و خلافیات کا حفظ

علامہ سید انور شاہ حدیث ہی کے حافظ نہ تھے، بلکہ فقہ اور خلافیات کے بھی حافظ تھے، تذکرہ کی کتابوں میں بعض ارباب کمال فقہاء کے متعلق یہ فقرہ لکھا ہوا ملتا ہے کان حافظاً للفقه والخلاف یا کان حافظاً للمذاهب، کہ وہ فقہ اور خلافیات کے حافظ تھے، مذاہب ائمہ ان کو یاد تھے، یہ بات علامہ سید انور شاہ کو بھی حاصل تھی، ان کو اصول و کلیات ہی نہیں جزئیات مسائل پر بھی عبور حاصل تھا، اور اختلافی مسائل میں ہر ایک امام کا مسلک بھی برزبان تھا، ہر مسئلہ میں ائمہ اور مشائخ کے مختلف اقوال بھی ازبر تھے، ائمہ اربعہ کے اختلافات کے منشا اور مبنی پر بھی ان کی نظر پوری طرح تھی، فقہ پر ان کی نظر جیسی غائر تھی، اور ائمہ کے اقوال جیسے کچھ انھیں مستحضر تھے، اسکا اندازہ موصوف کے حسب ذیل بیان سے کیا جا سکتا ہے:-

لیس عندی فن اصعب من الفقه	میرے نزدیک فقہ سے مشکل ترین فن کوئی نہیں

حتی انی فی الفنون کلها ذو رأی و تجربة احکم بما ارید و انتخب من اقوالهم ما ارید و افترع (اتفرع) الآراء من عندی لا احتاج الی تقلید احد ولکنی فی الفقه مقلد بحت لیس رای سوی الروایة ولذا اقد یصعب علی الافتاء فان الناس لا یکون عندهم الا قول واحد ویکون عندی فیه اقوال عن الامام او عن المشائخ والتصحیح قد یختلف، ولست من اصحاب الترجیح وحینئذٍ افتی بما یقرب بمذاهب الائمة وآثار السلف والسنة[1]

جملہ فنون میں میری ایک رائے اور تجربہ ہے کہ جس کی وجہ سے میں فیصلہ کرتا ہوں اور ائمہ فن کے اقوال میں سے جس کے قول کو چاہتا ہوں انتخاب کرتا ہوں، میں اپنی طرف سے انکی رایوں پر تفریع کرتا ہوں اور کسی کی تقلید کا محتاج نہیں ہوں لیکن فقہ میں مقلد محض ہوں، بجز روایت امام کے کوئی رائے نہیں رکھتا، اسی وجہ سے مجھے فتوی دینے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے کہ لوگوں کے سامنے ایک قول کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور میرے پیش نظر امام یا مشائخ کے متعدد قول ہوتے ہیں، پھر کبھی تصحیح میں بھی اختلاف ہوتا ہے اور میں اصحاب ترجیح میں سے نہیں ہوں، میں ایسے وقت میں مذاہب ائمہ اور آثار سلف اور سنت سے جو قریب تر قول ہوتا ہے اسی پر فتوی دیتا ہوں۔

طبقات فقہاء پر نظر طبقات فقہاء پر بھی انکی نظر غیر معمولی وسیع تھی، اور اس فن میں بصیرت کا یہ حال تھا کہ کبار فقہاء کے متعلق ان کی اپنی خاص آراء تھیں کہ کون کس درجہ کا فقیہ ہے، اور نقل میں اسکی کیا حیثیت ہے، کون فقیہ النفس ہے اور کون نہیں، چنانچہ امام ابوجعفر احمد بن محمد طحاوی المتوفی ۳۲۱ھ کے متعلق فرماتے ہیں:-

[1] ملاحظہ ہو فیض الباری ج ۴ ص ۱۹۷

"امام طحاوی، مذہب امام اعظم ہی کے سب سے زیادہ عالم نہیں بلکہ دیگر مذاہب ائمہ کے بھی سب سے زیادہ واقف تھے، وہ امام شافعی کے بیک واسطہ شاگرد تھے اور امام مالک سے بہ دو واسطہ تلمذ رکھتے تھے، اور امام اعظم ابوحنیفہ سے ان کو بہ واسطہ تلمذ کا فخر حاصل ہے، کتاب شرح معانی الآثار کے باب الحج میں موصوف نے تصریح کی ہے کہ امام احمد سے بھی ان کو بیک واسطہ اجازت حاصل ہے، طحاوی مجتہد و مجدد ہیں، جیسا کہ ابن الاثیر جزری نے لکھا ہے کہ وہ مجدد تھے،

میں کہتا ہوں کہ شرح حدیث ان کا تجدیدی کارنامہ ہے، وہ شرح حدیث میں مجمل حدیث کو بتاتے ہیں، حدیث کے غوامض و دقائق بیان کرتے ہیں بحث و تحقیق کرتے ہیں اعتراضات کے جوابات دیتے ہیں اور وہ اس انوکھے طریقہ کے امام ہیں کیونکہ متقدمین صرف احادیث کو بطور سند و متن روایت کرنے پر اکتفا کرتے تھے[1]، اور فیض الباری میں ہے کہ مالکیہ نے ان کی تصانیف سے حنفیہ کی بنسبت زیادہ اعتناء کیا ہے[2]"

علامہ موصوف ملک العلماء ابوبکر بن مسعود کاشانی المتوفی ۵۸۷ھ کی کتاب البدائع والصنائع فی ترتیب الشرائع کی بہت تعریف کرتے تھے، اور اس کے متعلق فرماتے تھے:-

عراقی فقہاء حنفیہ کی تالیفات میں خراسانی فقہاء حنفیہ کی تصانیف کی بنسبت زیادہ رسوخ و اتقان پایا جاتا ہے لیکن کتاب البدائع باوجودیکہ اس کا مؤلف ملک العلماء ابوبکر کاشانی خراسانی ہے مگر اس کی یہ کتاب اتقان و تثبت میں فقہائے عراق کی مثل ہے بلکہ حسن ترتیب میں ہمارے فقہاء حنفیہ رحمہم اللہ کی تمام کتابوں سے فائق ہے، یہ نہایت نادر المثال کتاب ہے، اگر کوئی عالم ژرف نگاہی اور دقت نظر سے اس کا مطالعہ کرے تو وہ

[1] ملاحظہ ہو العرف الشذی علی جامع الترمذی، مکتبہ رحیمیہ سہارنپور ص ۳۶ و معارف السنن از مولانا محمد یوسف بنوری طبع کراچی ۱۳۸۳ھ ج ۱ ص ۱۴ نیز فیض الباری ج ۳ ص ۱۵۱ و ج ۱ ص ۳،۳، [2] ایضاً فیض الباری ج ۳ ص ۲۹

فقیہ النفس بہجلیہ، یہ کتاب مدرس اور مولف کے لیے مفتی کی بہ نسبت زیادہ مفید ہے[1]"۔

مولف کے بارے میں ایسا بصیرت افروز تبصرہ فقہا میں سے کسی اور فقیہ سے منقول نہیں، اسی طرح علامہ موصوف کی فقیہ زین العابدین بن ابراہیم بن نجیم حنفی المتوفی ۹۷۰ھ، محمد امین بن عمر عابدین دمشقی حنفی المتوفی ۱۲۵۲ھ، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی المتوفی ۱۲۳۹ھ اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے متعلق جو رائے ہے وہ بھی پڑھنے کے لائق ہے، فرماتے ہیں:

ان ابن نجیم افقہ عندی من الشامی لما اری فیہ ان امارات التفقہ تلوح والشامی معاصر للشاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ وھو افقہ ایضاً عندی من الشامی رحمہ اللہ تعالیٰ ولکن الشیخ مشائخنا رشید احمد الگنگوھی قدس سرہ افقہ عندی من الشامی[2]

میرے نزدیک بلاشبہ ابن نجیم علامہ شامی سے زیادہ فقیہ ہیں، کیونکہ مجھے ان میں تفقہ کے آثار بہت روشن نظر آتے ہیں، فقیہ شامی شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کے معاصر ہیں اور میرے خیال میں شاہ صاحب شامی سے زیادہ فقیہ ہیں اور اسی طرح ہمارے شیخ الشیوخ رشید احمد گنگوہی قدس سرہ میرے نزدیک شامی سے بڑھکر فقیہ ہیں

بعض مشاہیر ائمہ فن کے متعلق رائے

اسی طرح دیگر ائمہ فن اور بعض بڑے علماء کے متعلق بھی ان کی خاص رائیں ہیں، چنانچہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی المتوفی ۶۳۸ھ، حافظ ابن تیمیہ المتوفی ۷۲۸ھ، شیخ تقی الدین بن دقیق العید المتوفی ۷۰۲ھ، حافظ ابن عبدالبر المتوفی ۴۶۳ھ، جمال الدین زیلعی المتوفی ۷۶۲ھ اور حافظ ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ کے متعلق علامہ موصوف فرماتے ہیں:

[1] ملاحظہ ہو نفحۃ العنبر من ہدی الشیخ الانور از مولانا محمد یوسف بنوری مجلس علمی ڈابھیل (سورت) ۱۳۵۵ھ ص ۸۵

[2] ملاحظہ ہو فیض الباری علی صحیح البخاری، مطبعہ مجازی، قاہرہ ج ۲ ص ۱۴۱ و ج ۱ ص ۱۲۰

"میرے نزدیک شیخ اکبر رحمہ اللہ تعالیٰ اس امت کی عظیم ترین شخصیتوں سے ہیں، وہ حقائق کی تہ تک پہنچتے ہیں اور اس فن میں وہ سب سے آگے ہیں اور اپنا نظیر نہیں رکھتے ہیں حافظ ابن تیمیہ بلاشبہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک بحر بیکراں ہے، لیکن چند اصولی اور فروعی مسائل میں وہ جمہور امت سے منفرد ہیں، حالانکہ حق پر جمہور علماء ہیں، ابن تیمیہ کشف و کرامات کے بھی منکر ہیں، البتہ صادق کشف کے قائل ہیں اور وہ اسکو فراست مومن سے تعبیر کرتے ہیں......... انکی طبیعت میں تیزی بہت ہے وہ اپنی تحقیق کو وحی آسمانی سمجھتے ہیں، اگرچہ وہ حقیقت کے خلاف کیوں نہ ہوں اور مخالف کی وہ پروا نہیں کرتے، اگرچہ وہ حق پر ہی کیوں نہ ہوں، یہ اہل علم کے وہ طبقات و مراتب ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا فرمایا ہے، ان میں سے بعض میں بڑا اعتدال ہے اور وہ نہایت انصاف پسند ہیں جیسے شیخ تقی الدین ابن دقیق العید ابن عبدالبر اور زیلعی، بعض میں اعتدال نہیں ہوتا، ان کی طبیعت میں شدت و حدت ہوتی ہے، جیسے ابن تیمیہ ہیں، بعض میں شدت تعصب کے ساتھ بیدار مغزی بلا کی ہوتی ہے، جیسے حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں[1]"۔

مصطلحات فن پر اضافے

علامہ سید انور شاہ نے مصطلحات فن پر بھی اضافے کئے ہیں، اصول فقہ جو ایک نہایت دقیق اور مشکل فن ہے اور ہمیشہ سے دقیقہ سنج اور دقیق النظر علماء کی بحث و نظر کی آماجگاہ بنا رہا ہے، اس اہم فن کی بعض مصطلحات پر علامہ موصوف کو اضافہ کا فخر حاصل ہے،

ائمہ فن نے متواتر کی تعریف کی ہے، اور تواتر اسناد کو بیان کیا ہے، لیکن نہ اس کے اقسام سے پورا اعتناء کیا اور نہ انھیں منضبط کیا اور نہ اس کے اقسام کو جداگانہ ناموں سے

[1] ملاحظہ ہو فیض الباری علی صحیح البخاری، مطبعہ مجازی، قاہرہ ج ۲ ص ۱۶۴

ممتاز و متعین کیا، تواتر کی بحث کلام اور اصول دونوں جگہ ہے، لیکن اصولیین اور متکلمین دونوں ہی اس باب میں خاموش ہیں، اسلامی دنیا میں علامہ سید انور شاہ نے پہلی مرتبہ تواتر کے اقسام سے اعتنا کیا اور اس کو اقسام اربعہ میں منحصر کیا، اس کی ہر قسم کو ایک خاص اور مستقل نام سے نامزد کیا، تواتر کے وہ اقسام اربعہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) تواتر الاسناد (۲) تواتر الطبقہ (۳) تواتر العمل والتوارث (۴) تواتر القدر المشترک۔

ان اقسام اربعہ کا تذکرہ علامہ موصوف نے اپنے رسالہ نیل الفرقدین فی مسئلۃ رفع الیدین (ص ۲۲) میں اور علامہ شبیر احمد عثمانی نے (مقدمہ) فتح الملہم بشرح صحیح مسلم (ص ۵) میں ان کی خوب وضاحت کی ہے، اور اردو میں اس کی تشریح فیصلہ مقدمہ بہاولپور طبع لاہور ۱۹۳۵ء میں بھی مذکور ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی نے اس تقسیم کی داد ان الفاظ میں دی ہے:۔

وھذہ الاقسام الاربعۃ للتواتر	یہ تواتر کی چار قسمیں ہیں، اگرچہ اس کی
وان کانت جزئیاتھا منتشرۃ	جزئیات اصولیین کی کتابوں میں منتشر
فی کتبھم لکنھم لم یکونوا	طور پر پائی جاتی ہیں، لیکن وہ تقسیم کے موقع
یذکرونھا عند التقسیم	پر ان کا تذکرہ نہیں کرتے تھے، سب سے پہلے
واول من ربع القسمۃ وسمّی	جس اصولی نے تواتر کو چار قسموں میں
کل قسم باسمہ فیما نعلم الشیخ	منقسم کیا اور ہر ایک قسم کو ایک مخصوص
العلامۃ الانور اطال اللہ بقاءہ	نام سے ممتاز و متعین کیا وہ ہمارے علم میں
وھو تقسیم حسن[1]	شیخ علامہ انور شاہ اطال اللہ بقاءہ ہیں۔

[illegible]

[1] ملاحظہ ہو مقدمہ فتح الملہم شرح صحیح مسلم، مدینہ برقی پریس بجنور ۱۳۵۲ھ ص ۶

علامہ سید انور شاہ کی اس تقسیم کی خوبی، ندرت اور جامعیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ جن ماہران فن نے مصطلحات فنون پر مستقل اور جداگانہ کتابیں لکھی ہیں اور درسی کتابوں کے حواشی سے بھی مفید مفید باتیں سمیٹ لی ہیں اور گوناگوں معلومات جمع کرنے میں خوب داد تحقیق دی ہے، ان کے یہاں بھی تواتر کے اقسام تواتر لفظی و معنوی سے زیادہ نہیں ہیں۔[1]

اسی طرح علامۂ موصوف نے حدیث صحیح کی بھی ایک جداگانہ تقسیم کی ہے، اور اس کو بھی اقسام اربعہ میں منحصر کیا ہے۔[2] اسی طرح طبقات کتب حدیث میں بھی علامۂ موصوف کی رائے جمہور علماء سے کچھ مختلف ہی ہے۔[3]

(باقی)

[1] ملاحظہ ہو کتاب التعریفات از سید شریف علی جرجانی المتوفی ۸۱۶ھ طبع مصر ۱۳۵۷ھ ص ۱۷۵، کتاب الکلیات از ابو البقاء حسینی کفوی المتوفی ۱۰۹۵ھ طبع بولاق مصر ۱۲۵۳ھ ص ۱۲۶، دستور العلماء از عبد النبی احمد نگری طبع دکن ج ۳ ص ۸، کشاف اصطلاحات الفنون از محمد اعلیٰ تھانوی طبع کلکتہ ۱۸۶۲ء ص ۱۴۷۰ تا ۱۴۷۳

[2] ملاحظہ ہو (مقدمہ) فیض الباری ج ۱ ص ۵۸ [3] ایضاً ج ۱ ص ۵۷۔

مقالات

امام العصر علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ

از

جناب مولانا عبد الحلیم صاحب چشتی ایم اے، فاضل دیوبند

(۲)

اہل کمال معاصرین کا خراج عقیدت | حقیقت یہ ہے کہ شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کے بعد ہندوستان کی سرزمین پر ایسا متقن، وسیع النظر محقق اور جامع عالم پیدا نہیں ہوا، اور ہندوستان اور پاکستان کے متاخرین محدثین میں ملا محمد عابد سندی المتوفی ۱۲۵۷ھ کے بعد سید انور شاہ کے سوا کوئی حافظ حدیث نہیں گذرا۔

علامہ موصوف بلاشبہہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے تھے، اور اس دور میں اللہ تعالیٰ کی زبردست حجت اور برہان تھے، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فتح الملہم بشرح صحیح مسلم میں ایک موقع پر علامہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

سالت الشیخ العلامۃ النقی التقی	میں نے خدا ترس، پاک طینت، شیخ العلامہ
الذی لم تر العیون مثلہ ولم	انور شاہ جن کا مثل آنکھوں نے نہیں دیکھا
یرھو مثل نفسہ ولو کان فی	اور نہ خود انھوں نے اپنا مثل دیکھا ہے

سالف الزمان لکان لہ شأن فی طبقۃ اهل العلم عظیم وهو سیدنا ومولانا الانور الکشمیری ثم الدیوبندی اطال اللہ بقائہ عن تفسیر اوائل سورۃ النجم وتحقیق رویۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ربہ فقرر الشیخ تقریرًا حسنًا بلیغًا جامعًا لاشتات الروایات واطراف الکلام منبهًا علی اغوار القرآن فالتمست منه ان یقیدہ بالکتابۃ لتعم الفائدۃ فاستجاب للملتمس وعلی اللہ اجرہ مع وجود الشواغل الکثیرۃ[1]

اگر وہ گذشتہ زمانے میں ہوتے تو اہل علم کے طبقہ میں ان کا بڑا مرتبہ ہوتا، وہ ہمارے سردار مولانا انور شاہ کشمیری ثم دیوبندی ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں تادیر قائم رکھے، میں نے ان سے سورۂ النجم کی ابتدائی آیتوں کی تفسیر اور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار الٰہی کی تحقیق کے متعلق درخواست کی تھی جس کو انھوں نے شرف قبول بخشا اور نہایت نفیس اور فصیح و بلیغ تقریر کی جس میں متفرق روایات اور بحث کے تمام گوشوں کو سمیٹ لیا ہے، اور قرآن مجید کی گہرائیوں پر تنبیہ فرمائی ہے، پھر میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اس کو قلمبند فرمائیں تاکہ اس کا فائدہ عام ہو جائے، انھوں نے گوناگوں مشغولیتوں کے باوجود میری یہ بات بھی مان لی، اللہ تعالیٰ اس کا اجر دے۔

مفسر عثمانی آیت شریفہ قل یا اهل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم الا

[1] ملاحظہ ہو فتح الملہم بشرح صحیح مسلم، ج ۱، ص ۳۳۵

نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئًا ولا یتخذ بعضنا بعضًا اربابًا من دون اللہ کی تفسیر میں حیات مسیح علیہ السلام کے موضوع پر علامہ کے رسالہ کا تعارف کراتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"اس موضوع (حیات مسیح علیہ السلام) پر مستقل رسالے اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں، مگر میں اہل علم کو توجہ دلاتا ہوں کہ ہمارے مخدوم علامہ فقید النظیر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری اطال اللہ بقائہ نے رسالہ "عقیدۃ الاسلام" میں جو علمی لعل و جواہر ودیعت کیے ہیں ان سے متمتع ہونے کی ہمت کریں، میری نظر میں ایسی جامع کتاب اس موضوع پر نہیں لکھی گئی"۔

اور آیت شریفہ قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلاً کی تفسیر میں روح پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اس (بحث) میں میرے نزدیک قول فیصل وہی ہے جو بقیۃ السلف بحر العلوم سید انور شاہ صاحب اطال اللہ بقائہ نے فرمایا ہے"۔

علامہ شبیر احمد عثمانی نے فیض الباری علی صحیح البخاری پر جو تقریظ لکھی ہے، اس میں تحریر فرماتے ہیں

قال الشیخ تاج الدین السبکی فی حق القفال المروزی، کان امامًا کبیرًا وبحرًا عمیقًا غواصًا علی المعانی الدقیقۃ، نقی القریحۃ ثاقب الذهن، عظیم المحل کبیر الشان، دقیق النظر، عدیم النظیر (فی زمانہ) اه

شیخ تاج الدین سبکیؒ نے قفال مروزی کے بارے میں فرمایا تھا کہ وہ بلند پایہ امام اور علم کے گہرے سمندر، دقیق معانی کے غوطہ زن، پاکیزہ طبع، روشن دماغ، باعظمت، بلند مرتبت، دقیق النظر اور یگانۂ عصر عالم تھے،

وحکی قول ابن السمعانی فیه:
کان وحید زمانه فقهاً
وحفظاً وورعاً
هذه کلمات کنت رایتها فی
حق ذلک الامام، وصادفتها
تصدق فی نابغة الهند الشهیر
وعالمها بحر العلوم مولانا السید
محمد انور شاه الکشمیری
ثم الدیوبندی رحمه الله
سواء بسواء من غیر شطط
والحواء، فکان اماماً کبیراً
وبحراً عمیقاً غواصاً علی المعانی
الدقیقة الی آخر ما قال
لم اکن فی عداد اصحابه وتلامذته
غیر انی وفقت للاستفادة
من صحبته ومجالسه ومذاکرته
فی المشکلات والغوامض
برهة غیر قصیرة ومن طالع
کتابی فتح الملهم علی شرح صحیح

اور ان کے متعلق ابن السمعانی کا بیان نقل کیا ہے کہ وہ فقہ، حفظ حدیث اور ورع وتقویٰ میں یکتائے روزگار تھے۔

یہ کلمات میں نے اس امام موصوف کے بارے میں پڑھے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی کلمات ہندوستان کے مشہور و معروف عالم بحر العلوم سید محمد انور شاہ کشمیری ثم دیوبندی رحمہ اللہ پر بھی پورے پورے صادق آتے ہیں اور اس میں ذرا مبالغہ نہیں ہے کیونکہ یہ بھی بلند پایہ امام، علم کے گہرے سمندر تھے انھیں دقیق معانی تک رسائی حاصل تھی ....

میں نہ انکے تلامذہ میں سے ہوں اور نہ میرا ان کے ہم سبقوں میں شمار ہے، بس مجھے انکی صحبت اور مجلسوں میں انکے ساتھ مشکلات فن اور دقیق مسائل میں مذاکرہ سے ایک زمانۂ دراز تک استفادہ کا موقع ملتا رہا ہے جو کوئی

مسلم تبین له ذالک

(ملاحظہ ہو مقدمہ فیض الباری ص ۸)

میری کتاب فتح الملہم شرح صحیح مسلم کا مطالعہ کریگا اس پر یہ حقیقت روشن ہوجائیگی۔

مورخ ہند مولانا سید سلیمان ندوی نے علامۂ موصوف کی جن الفاظ میں تصویر کھینچی ہے وہ بھی ہدیۂ ناظرین ہے، فرماتے ہیں:-

"مرحوم کم سخن لیکن وسیع النظر عالم تھے، ان کی مثال اس سمندر کی سی تھی جس کی اوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قیمت خزانوں سے معمور ہوتی ہے، وہ وسعت نظر، قوت حافظہ اور کثرت حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے، علوم حدیث کے حافظ اور نکتہ شناس، علوم ادب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر وسخن سے بہرہ مند اور زہد وتقویٰ میں کامل تھے، اللہ تعالیٰ اپنی نوازشوں کی جنت میں ان کا مقام اعلیٰ کرے کہ مرتے دم تک علم ومعرفت کے اس شہید نے قال اللہ وقال الرسول کا نعرہ بلند رکھا .... حضرت مرحوم سے ملاقاتوں میں علمی استفادہ کے موقعے ملتے رہے، ہر سوال کے وقت ان کی خندہ پیشانی سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ سوال سے خوش ہوئے، اہل کمال کی یہ بڑی پہچان ہے کیونکہ وہ مشکلات سے عبور کر چکتا ہے، اب جب اس سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ شبہہ کے اصل منشاء کو سمجھ جاتا ہے اور جواب دیکر خوش ہوتا ہے،

مرحوم معلومات کے دریا، حافظہ کے بادشاہ اور وسعت علمی کی نادر مثال تھے، ان کو زندہ کتب خانہ کہنا بجا ہے، شاید ہی کوئی کتاب مطبوعہ ہو یا قلمی ان کے مطالعہ سے بچی ہو۔"[1]

[1] ملاحظہ ہو یادرفتگاں، مکتبۃ الشرق آرام باغ کراچی ۱۹۵۵ء ص ۱۶۹ و ۱۷۰

علامہ سید انور شاہ کی جلالت علمی اور رفعت شان کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسا عالم ربانی کسی موقعہ پر کسی علمی مسئلہ کی وضاحت کرتا اور وضاحت کی کہیں سید انور شاہؒ سے داد تحقیق مل جاتی تو ان کو بڑی مسرت ہوتی تھی، چنانچہ الافاضات الیومیہ میں مذکور ہے:-

"مولانا سہول احمد صاحب نے کچھ سوالات علمی فرمائے، حضرت والا نے اس سلسلہ میں فرمایا کہ اصول فقہ کا جو یہ مسئلہ ہے کہ "العبرۃ لعموم الالفاظ لا بخصوص المورد" اس میں میرے نزدیک اتنی قید اور ضروری ہے کہ وہ عموم مراد متکلم سے متجاوز نہ ہو، دلیل اس کی وہ واقعہ ہے جو حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ سفر میں ہے اور بیہوش پڑا ہے، تحقیق سے معلوم ہوا کہ روزہ رکھے ہوئے ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لیس من البر الصیام فی السفر، تو یہاں پر اس حدیث کے الفاظ تو عام ہیں ہر مسافر کے لیے، چنانچہ بعض نے یہی سمجھا مگر بعض صورت میں اذن صوم فی السفر سے اس کا تعارض ہوگا، لیکن قرائن سے کوئی مجتہد ذوقاً حکم کر سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ عموم مقصود نہیں بلکہ اس قید کے ساتھ عموم مقصود ہے کہ جس کی ایسی حالت ہو جائے، اور جمہور کا یہی مذہب ہے، پس معلوم ہوا کہ جمہور کے نزدیک اس اصولی مسئلہ میں عموم کے اندر عدم تجاوز از مراد متکلم کی قید معتبر ہے گو مصنفین نے تصریحاً اس کا ذکر نہیں کیا، جب میں نے مراد آباد میں ایک وعظ میں یہ مضمون بیان کیا تھا اس میں مولانا انور شاہ صاحب مرحوم بھی تھے، بعد وعظ کے شاہ صاحب سے کسی شخص نے ایک مسئلہ دریافت کیا تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ کیا تم نے سنا نہیں، ابھی تو وعظ میں (میری طرف اشارہ کر کے کہا) اس نے

مسئلہ بیان کیا ہے کہ اس قاعدہ میں یہ قید بھی ملحوظ ہے، پھر حضرت حکیم الامت دام ظلہم العالی نے فرمایا کہ اس سے مجھکو خوشی ہوئی کہ شاہ صاحب نے اس پر انکار نہیں فرمایا بلکہ اس سے اثبات فرمایا"[1]

ایک اور موقعہ پر حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے موصوف کی حق پسندی اور کمال علمی و عملی کی داد تحقیق یوں دی ہے، فرماتے ہیں:-

مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریکات حاضرہ میں بہت سرگرم تھے، اور میں بالکل علٰحدہ تھا، لیکن باوجود اس اختلاف مشرب کے میرے رسالہ ترجیح الراجح سے بہت متاثر تھے اور کہتے تھے کہ صدیوں کے بعد یہ بات نظر آئی ہے کہ اپنی لغزشوں سے رجوع کر کے اس کو شائع کیا جاوے۔ یہی ایک بات حق پسندی اور کمال علمی و عملی کے لیے کافی ثبوت ہے جس کی اس وقت میں کہیں نظیر نہیں۔"[2]

انسان کا چہرہ اس کے خیالات اور علوم کا آئینہ دار ہوتا ہے، علامہ سید انور شاہ کا چہرہ اس حقیقت کا پورا پورا مصداق تھا، چہرۂ انور پر علم کا ایسا نور تھا کہ مسلمان ہی نہیں، کافر بھی اگر نظر بھر کر دیکھ لیتا تو پکار اٹھتا تھا کہ یہ چہرہ تو کسی بہت ہی بڑے عالم کا ہے، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کا بیان ہے:-

"مولانا (انور شاہ) کسی جلسۂ مناظرہ (بھاگل پور) میں شریک تھے جس میں اور بڑے بڑے علماء موجود تھے، اس جلسہ کا صدر ایک ہندو کو بنایا گیا تھا جو بہت معمر اور تجربہ کار شخص تھا، وہ جس وقت جلسہ میں آیا اس نے سب علماء کو دیکھ کر مولانا کے متعلق

[1] ملاحظہ ہو الافاضات الیومیہ من الافادات القومیہ ج ، ص ۶۳ ہم [2] ایضاً ج ، ص ۲۲۷

کہا کہ ان سب میں یہ بڑے عالم معلوم ہوتے ہیں، واقعی غضب کا قیافہ شناس شخص تھا، کہ محض صورت دیکھ کر پہچان گیا کہ یہ سب سے بڑے عالم ہیں، حالانکہ اس وقت تک کسی کی تقریر بھی نہیں سنی تھی۔“[1]

علامہ سید انور شاہ ورع و تقویٰ کی صفات سے آراستہ اور محاسن اعمال اور مکارم اخلاق کے پیکر تھے، حق گوئی اور اتباع سنت کے بڑے دلدادہ تھے، اس کے آثار ان کے چہرے بشرے سب پر نمایاں تھے، ان کی ذات حقیقت میں نور علیٰ نور تھی۔

اردو کی کتابوں کے مطالعہ کا شوق علامہ سید انور شاہ نے درس و تدریس اور وعظ و تقریر میں طلبہ اور عوام کی سہولت کی وجہ سے اردو زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا، لیکن اردو زبان میں حقائق و علوم چونکہ منتقل نہیں ہوئے تھے اس لیے موصوف نے اردو میں لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا اور نہ اس میں تصنیف و تالیف کو پسند کیا، مگر جب اہل حق نے اردو زبان میں تصنیف و تالیف کر کے علوم کو عام کرنا شروع کیا تو موصوف نے بھی اردو کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، اس کا اندازہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حسب ذیل بیان سے کیا جاسکتا ہے، فرماتے ہیں:-

”مولانا انور شاہ صاحبؒ نے ایک صاحب سے فرمایا کہ میں یہ سمجھتا تھا کہ اردو کی کتابوں میں علوم نہیں ہیں، اس لیے میں کسی کی اردو تصانیف کو دیکھنا بیکار سمجھتا تھا، لیکن جب سے تفسیر بیان القرآن[2] دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ معلوم ہوا کہ اردو کی تصانیف میں بھی

[1] ملاحظہ ہو الافاضات الیومیہ ج، ص ۱۱۲ [2] حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی تصانیف میں جو کتابیں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں ان میں تفسیر بیان القرآن کا نام سرفہرست آتا ہے، اس کی وجہ موصوف کی اس فن سے مناسبت اور اس فن میں مہارت ہے، موصوف کا بیان ہے:-
(باقی حاشیہ ص ۲۵۳ پر)

اب علوم موجود ہیں اور اس وقت سے مجھے اردو کی کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہوگیا اور

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۲) ”الحمد للہ میں اپنی کھلی ہوئی حالت رکھتا ہوں اس خیال سے کہ کسی کو دھوکہ نہ ہو اور جو بات میرے اندر منجملہ نعم الٰہیہ ہے اس کو بھی ظاہر کر دیتا ہوں اور جو نقص کی ہو اس کو بھی ظاہر کر دیتا ہوں، چنانچہ چار علوم جو بڑے ہیں تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف ان میں سے دو سے مجھکو بقدر ضرورت مناسبت ہے، وہ بھی حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعا کی برکت سے ہے، ایک موقع پر یہ فرمایا تھا کہ تفسیر اور تصوف سے تجھکو مناسبت ہوگی، اگر اس وقت خیال آتا تو حدیث و فقہ کے لیے بھی دعا کرا لیتا اور یوں بقدر حاجت حدیث و فقہ سے بھی اللہ کے فضل و رحمت سے کام نکال لیتا ہوں مگر جس کو مناسبت کہتے ہیں وہ نہیں۔“

(الافاضات الیومیہ طبع تھانہ بھون ۱۹۳۹ء ج۵ ص ۱۸۴ و ۱۸۵)

حکیم الامت کو تصنیف سے چونکہ زیادہ شغف اور دلچسپی نہیں تھی اس لیے تفسیر بیان القرآن میں موصوف نے بڑی محنت کی ہے، اس امر کا اندازہ موصوف کے حسب ذیل بیان سے کیا جاسکتا ہے:-

”ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت کو تو علاوہ اور کاموں کے ڈاک ہی مستقل کام بہت ہے، فرمایا کہ نرے ڈاک کے کام سے مجھ پر تعب نہیں ہوتا، البتہ تصنیف کے کام سے تعب ہوتا ہے، سو تصنیف کا کام اب نہیں ہوتا، تصانیف میں تمام مضامین پر احاطہ کرنا پڑتا ہے، اس لیے تصنیف کا کام بہت بڑا ہے، پہلے دماغ میں تمام مضامین کا جمع کرنا، پھر مرتب کرنا، ان کو محفوظ رکھنا بہت ہی بڑی مشقت کا شغل ہے،

ایک سبب تصنیف کی دشواری کا میرے لیے یہ بھی ہے کہ کتابوں پر میری نظر نہیں، درسی کتابوں کے علاوہ اور کتابیں میں نے دیکھیں نہیں، ہاں درسی کتابیں پہلے بحمد اللہ اچھی طرح مستحضر تھیں، مگر اب ان میں بھی ذہول شروع ہوگیا، اور تصنیف کے لیے صرف درسی

(باقی حاشیہ ص ۲۵۴ پر)

جو بے دقتی اردو کی کتابوں کی میرے خیال میں پہلے بھی ہو جاتی رہی۔ (ملاحظہ ہو الافاضات الیومیہ ج ...)

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۳) کتابیں کافی نہیں، یہی وجہ ہے کہ میری تصانیف کا زیادہ حصہ غیر منقولات ہیں، اب اگر میرے پاس کتابیں نہیں اور جو ہیں ان پر نظر نہیں، اور تصنیف بدون کتابوں پر نظر ہوئے مشکل ہے جس کا اب تحمل نہیں۔" (الافاضات الیومیہ ج ۶ ص ۲۳۴ و ۲۳۵)

تفسیر بیان القرآن کی افادیت واہمیت اور عظمت کا صحیح اندازہ اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب جب اس فن کی مشہور تفسیریں نظر سے گذر چکی ہوں اور جو اشکال ان کتابوں میں حل ہونے سے رہ گیا ہو موصوف نے اس میں حل کر دیا ہے اور بعض مقامات پر فخر رازی سے اونچی اور بہتر تفسیر کی ہے اور یہی اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے، اس سلسلہ میں حکیم الامت کا بیان پڑھنے کے لائق ہے، فرماتے ہیں:

"بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ تمہاری تفسیر میں کیا ہے، میں کہا کرتا ہوں کہ کسی مقام پر اشکال ہو تو اول اور تفسیروں میں دیکھو، پھر اس میں دیکھو تب معلوم ہوگا کہ اس میں کیا ہے۔"

(حسن العزیز مکتبہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون ۱۳۸۶ھ ج ۲ حصہ سوم ص ۸۴)

اسی وجہ سے اکابر اہل علم اس تفسیر کا مطالعہ کرتے رہے ہیں اور ان ہی وجوہ سے موصوف کو اپنی تصنیف ہی سے اس کی تکمیل کی بڑی آرزو تھی، چنانچہ حسن العزیز (ج ۲ ح ۳ ص ۴۲) میں مذکور ہے:

"ایک صاحب نے حضرت والا سے تفسیر بیان القرآن کے متعلق کچھ باتیں دریافت کیں .....

ان صاحب کے سوالات کے جوابات دینے کے بعد فرمایا کہ زمانہ تصنیف تفسیر میں بالکل بیمار نہیں ہوا کان بھی گرم نہ ہوا، اس زمانہ میں تھان (تھانہ بھون) میں طاعون بہت تھا، میں اللہ سے دعا مانگتا تھا کہ اے اللہ میں تفسیر لکھنے سے پہلے نہ مروں۔"

اس اہم تفسیر کی تکمیل کی مدت بھی زیادہ نہیں ہے، حکیم الامت مقالات حسنہ ملقب بہ لمعان ال... فی رمضان الاربعین (ص ، طبع تھانہ بھون ۱۳۴۹ھ) میں فرماتے ہیں:

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۴) "تفسیر بیان القرآن اڑھائی سال میں لکھی گئی، اس عرصہ میں کوئی سفر نہیں کیا، تفسیر اور مثنوی کی شرح لکھنے کا بہت شوق تھا، الحمد للہ کہ خدائے برتر نے میرے شوق کو پورا کیا۔"

حکیم الامت نے تفسیر بیان القرآن کے لکھتے وقت کن باتوں کا التزام کیا تھا، اس کے متعلق موصوف کا بیان پڑھنے کے لائق ہے، فرماتے ہیں:-

"تفسیر میں میرا یہ التزام تھا کہ پہلے معری قرآن مجید لیکر اس کا خوب مطالعہ کرتا تھا، جب شرح صدر ہو جاتا تو پھر تفسیروں کا مطالعہ کرتا، اگر وہ تفسیروں کے مطابق ہوتا تو درج کرتا، اگر محض قرآن مجید کے مطالعہ سے شرح صدر نہ ہوتا تو پھر تفاسیر کی طرف رجوع کرتا، اگر تفاسیر کے مطالعہ سے شرح صدر ہوتا تو درج کرتا ورنہ بارگاہ خداوندی میں نہایت ابتہال اور تضرع زاری سے دعا کرتا تو کبھی عین دعا میں شرح صدر ہو جاتا اور کبھی آدھ گھنٹہ بعد، کبھی کبھی شرح صدر ہونے کے انتظار میں دیر دیر تک ٹہلتا، پھر بعد شرح صدر تفاسیر کو دیکھتا اگر اس مضمون کی تائید ان سے ہوتی تو درج کرتا ورنہ چھوڑ دیتا، اور میں نے کبھی تفسیر کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا بلکہ اکابر کی طرف منسوب کیا، ہاں بعض نکات کو اپنی جانب منسوب کیا،

اس عرصہ میں طاعون کا بھی زور تھا مجھے خدشہ تھا کہ تفسیر رہ نہ جائے مگر حق تعالیٰ کے فضل سے میں اس عرصہ میں بیمار تک نہیں ہوا، البتہ بعض دفعہ معمولی زکام تو ہوا، اور اسی طرح مثنوی کی شرح میں بھی اور بعد فراغت کے تعب کا ظہور ہوا اور خوب بیمار ہوا۔

اور عنوان جو تفسیر میں جلی قلم سے لکھے ہیں ان کے قائم کرنے میں نہایت دقت ہوئی اور یہ گویا علوم قرآن ہیں، اور بعض جگہ بدلنے بھی پڑے، ایک شخص نے عرض کیا کہ گویا یہ تراجم بخاری ہیں فرمایا ہاں، مگر تراجم مغلق ہیں یہ سہل ہیں،

تفسیر لکھنے کے زمانہ میں روپیہ بھی بہت آیا اور خوب کھایا اور بڑے بڑے منی آرڈر ذرا ذرا شبہ پر واپس کیے اور پھر لوٹ پھیر کرائے۔" (مقالات حسنہ ص ۴۸ و ۵)

امتیازی شان طلبہ میں حدیث فہمی کا صحیح مذاق اور فقہ حدیث کا ملکہ راسخہ پیدا کرنا تھا، فقہ حدیث نہایت غامض علم ہے، اسی لیے محدثین اور فقہا کے مقابلہ میں فقہاء محدثین کی تعداد نہایت قلیل ہے، اس فن کے ماہرین انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے "عجالہ نافعہ" میں فقہ حدیث کے ائمہ فن کو نام بنام گنایا ہے، دارالعلوم دیوبند کے قیام کی اصل غایت اسی علم کی نشر و اشاعت ہے، اس فن میں اکابر دیوبند کا طریقہ انیقہ نہایت معتدل ہے، درس حدیث میں علامہ سید انور شاہ کے تجدیدی کارناموں پر روشنی ڈالنے سے پہلے اکابر دیوبند کے طریقہ انیقہ کو سمجھنا ضروری ہے، اس کی وضاحت کے لیے علامہ سید انور شاہ کی وہ تاریخی تقریر جو موصوف نے ۱۳۲۹ھ میں عالم اسلام کے نہایت نامور فاضل اور وسیع النظر محدث علامہ سید رشید رضا المتوفی ۱۳۵۴ھ کی دارالعلوم دیوبند میں آمد کے موقعہ پر کی تھی، پیش کرنا کافی ہے، اس اہم تاریخی تقریر کا موضوع "فقہ حدیث اور اکابر دیوبند کا طریقہ انیقہ" ہے، علامہ موصوف کی یہ تقریر عربی میں ہے لیکن طویل ہے اس لیے اس کا ترجمہ لکھا جاتا ہے:۔

"مدرسہ دیوبند کی غایت و غرض درس حدیث اور فقہ حدیث ہے..... ہمارے اکابر کا حدیث اور فقہ حدیث میں ایسا معتدل و بہتر طریقہ ہے، جس میں افراط و تفریط نہیں ہے، میری مراد اس سے یہ ہے کہ ائمہ اربعہ (امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ اور احمدؒ) اکثر و بیشتر اصول اربعہ کی پابندی کرتے ہیں، اور وہ اس طرح سے کہ امام مالکؒ اہل مدینہ کے عمل کی اقتدا کرتے ہیں، بلکہ کبھی وہ حدیث مرفوع پر بھی اس کو ترجیح دیتے ہیں، امام شافعیؒ ہر باب میں اصح حدیث سے استدلال کرتے ہیں، امام احمدؒ اصح، صحیح، حسن اور ضعیف حدیث سے بھی جس کا ضعف کمتر درجہ کا ہو استدلال کرتے ہیں، اور وہ ان دونوں طریقے (اصح و صحیح اور حسن و ضعیف) کو درست سمجھتے ہیں، موصوف نے اپنی مسند

میں اسی طریقہ کو اختیار کیا ہے، اور ابو حنیفہؒ ان قسموں کی تمام حدیثوں کو قابل عمل سمجھتے ہیں، اور اختلاف کی صورت میں ان کو ایک محمل پر جمع کرتے ہیں، اسی وجہ سے حنفیہ کے یہاں تاویلات زیادہ ہیں اور شوافع کے یہاں کے راویوں پر جرح زیادہ ہے، امام شافعیؒ پہلے امام ہیں جو بلا مؤید و عاضد اور شاہد حدیث مرسل کو قابل حجت نہیں سمجھتے ہیں۔

فن حدیث کے نکتہ شناس امام بخاریؒ نے امام مالکؒ و شافعیؒ کے اصول کو اپنایا اور اپنا خضر راہ بنایا، چنانچہ وہ صحیح بخاری میں اصح ما فی الباب کو لاتے ہیں، اور عمل سلف کی موافقت کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں، اسی وجہ سے وہ اپنی کتاب میں کوئی ایسی حدیث ذکر نہیں کرتے جو دوسری حدیث کے معارض و مخالف ہو، انھوں نے صلوٰۃ کسوف کے بیان میں دو رکوع والی حدیث پر اکتفا کیا اور اپنے اصول و قواعد کی پابندی کی، تین، چار اور پانچ رکوع والی حدیثوں کو نظر انداز کر دیا،

امام مسلمؒ نے راویوں کی ثقاہت پر اعتماد کیا، چنانچہ انھوں نے باب الکسوف میں تین چار رکوع والی حدیثوں کو ہی نہیں بلکہ پانچ رکوع والی حدیث کو بھی جو امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے (کوئی مرفوع حدیث نہیں ہے) صحیح مسلم میں درج کیا ہے، امام بخاری نے تحقیق و تنقیح کی ہے اور امام مسلم نے اصول و قواعد کی رعایت کی ہے، ایسی اختلافی صورتوں میں ہمارے مشائخ توسط و اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں، تشدد اور تساہل سے گریز کرتے ہیں اور متعارض حدیثوں کی ایسی توجیہ کرتے ہیں کہ جو غور سے سنتا ہے قبول کرتا ہے، اس کی مثال حدیث قلتین ہے، اس کو یزید بن زریع کامل بن طلحہ، ابراہیم الحجاج، ہدبہ بن خالد، وکیع اور یحییٰ بن حسان نے اذا بلغ الماء قلتین او ثلاثا" "جب پانی دو تین قلہ (بڑا مٹکا جس میں اڑھائی مشک پانی آتا ہے) ہو

وہ ناپاک نہیں ہوتا، بلفظ تنویع (او) کے ساتھ روایت کیا ہے تو یہ تخمین و اندازہ کے لیے ہے کہ جب دو تین قلہ پانی ہوگا تو ایک طرف سے دوسری طرف نجاست کا اثر نہ ہوگا اور امام ابوحنیفہؒ، ابو یوسفؒ اور محمدؒ کا یہی اصل مذہب ہے، چنانچہ شیخ ابن ہمامؒ اور شیخ ابن نجیم نے اس امر کی تصریح کی ہے، حدیث قلتین کے محمل کے تعین سے جو حدیثیں اس کے معارض تھیں وہ اپنے حال پر باقی رہیں اور معارضہ سے بچ گئیں، جیسے ٹھیرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے کی ممانعت والی حدیث، اور سو کر اٹھنے والے کو پانی میں ہاتھ ڈالنے کی ممانعت والی حدیث، اور برتن میں کتے کے منہ ڈالنے والی حدیث، اپنے اپنے محل میں قابل عمل ہیں۔

اور اس کی مثال دیگر امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے والی حدیثیں ہیں، حنفیہ نے نماز میں امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھنے پر قرآنی آیت واذا قرئ القرآن فاستمعوا وانصتوا لعلکم ترحمون جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو، اور حدیث رسول واذا قرئ القرآن فانصتوا جب امام پڑھے تو تم چپ رہو، اور حدیث من کان لہ امام فقراءۃ الامام لہ قراءۃ (جس کا امام ہو تو امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے) سے استدلال کیا، اور انھوں نے حدیث لا تفعلوا الا بام القرآن (سورہ فاتحہ کے اور کچھ نہ پڑھا کرو) والی حدیث کی تاویل کی کیونکہ جس نے سورہ فاتحہ نماز میں نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں ہوئی، اور یہ اس لیے کیا کہ آیت شریفہ کے شان نزول میں کوئی صحیح روایت نہیں ہے، لہذا لفظ کے عموم کا اعتبار ہوگا (نہ خصوص مورد کا) نیز امام بیہقی نے کتاب القراۃ میں امام احمدؒ سے نقل کیا ہے کہ علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ یہ آیت نماز میں قرأت کے بارے میں اتری ہے اور حدیث واذا قرئ فانصتوا جب امام پڑھے تو تم چپ رہو،

صحیح حدیث ہے، امام احمد بن حنبل اور ان کے شاگرد ابوبکر بن الاثرم نے اس کی تصحیح کی ہے، پھر امام مسلم نے باب التشہد میں حدیث کے ہر دو طریق، ابو موسیٰ اشعریؓ و ابو ہریرہؓ کی تصحیح کی ہے اور بعد ازاں ابن خزیمہ، حافظ ابوجعفر جریر طبری، حافظ ابو عمر بن عبد البر حافظ ابن حزم اندلسی ظاہری، حافظ زکی الدین عبد العظیم منذری، خاتم الحفاظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں اس حدیث کی تصحیح کی ہے، یہ تو اسناد کے اعتبار سے اس حدیث کا پایہ ہے، اور باعتبار تعامل سلف و ائمہ تو اس پر صحابہ کرام کی بڑی جماعت امام مالک، احمد، ابوحنیفہ کا اس پر عمل ہے، اور ایسی حدیث جس کے راوی ثقہ ہوں پھر سلف کا عمل بھی اس کا موید ہو تو وہ حدیث صحیح ہے، وہ نہ کسی جرح سے متاثر ہوتی ہے اور نہ کسی قدح سے اثر پذیر۔

اور حدیث من کان لہ امام فقراءۃ الامام لہ قراءۃ کو شیخ ابن الہمام نے مسند احمد ابن منیع سے نقل کیا ہے، اور اس کی تصحیح بھی کی ہے، کیونکہ اس کی سند بخاری و مسلم شرط پر ہے، اور ہمیں اب تک اس میں کسی علت کا سراغ نہیں لگ سکا ہے، اس کی سند یہ ہے اخبرنا اسحق بن یوسف الازرق قال حدثنا سفیان وشریک عن موسیٰ بن ابی عائشۃ عن عبد اللہ بن شداد عن جابر بن عبد اللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحدیث، اور پھر ترمذی کی ایک موقوف اور حدیث کی دیگر کتب میں ایک مرسل حدیث اس کی موید اور معاضد ہے، اب تو وہ بلاشبہہ صحیح ہے۔

ہمارے شیخ الشیوخ مولانا رشید احمدؒ نے حدیث عبادہؓ کی جو محمد بن اسحق کے طریق سے مروی ہے اور اس کے سیاق لعلکم تقرأون خلف امامکم قالوا نعم یا رسول اللہ نفعل ہذا قال فلا تفعلوا، الحدیث، شاید تم اپنے امام کے پیچھے پڑھتے ہو، لوگوں نے

عرض کیا جی ہاں یا رسول اللہ ہم جلدی جلدی پڑھ لیتے ہیں، تو آپ نے فرمایا سورہ فاتحہ کے علاوہ کچھ نہ پڑھا کرو، (کی توجیہ میں فرمایا یہ اباحت اور جواز کی دلیل تو ہو سکتی ہے اور وجوب کی دلیل نہیں، کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر پڑھتے تھے، اسی بنا پر آپ نے ان سے دریافت فرمایا تھا کہ شاید تم میرے پیچھے پڑھتے ہو! انھوں نے جواب دیا جی ہاں تو آپ نے فرمایا بس سورہ فاتحہ پڑھ لیا کرو، کیونکہ قرآن کی تمام سورتوں میں سورۂ فاتحہ کا نماز کے لیے پڑھنا متعین ہو چکا ہے، کہ امام اور منفرد کی نماز اس کے پڑھے بغیر نہیں ہوتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امام کے پیچھے سورہ فاتحہ کے پڑھنے کے جواز کی علت یہ بتائی ہے کہ وہ قرآن کی تمام سورتوں میں نماز کے لیے متعین ہو چکی ہے، اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی، امام اور منفرد کے حق میں اس سورہ کے پڑھے بغیر نماز کا نہ ہونا ظاہر ہے اور مقتدی کے حق میں اس کا اثر کم سے کم اباحت ہوا، حنفیہ کا اس کے واجب نہ ہونے پر اتفاق ہے البتہ اس کی اباحت و کراہت کا مسئلہ احناف میں مختلف فیہ ہے۔

اور ہمارے مشائخ نے مسئلہ رفع یدین اور آمین بالجہر کے مسئلہ میں فرمایا ہے کہ نماز میں رفع یدین کرنا اور با آواز بلند آمین کہنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ سے ثابت ہے، اور اسی طرح رفع یدین اور اخفاء آمین بھی صحیح سند سے ثابت ہے، چنانچہ سنن ابی داؤد میں امیر المومنین عمرؓ اور علیؓ سے ترک رفع یدین اور اسی طرح اخفاء آمین صحابہؓ کی ایک جماعت اور سلف صالحین سے ثابت ہے، تو ایسی صورت میں ان دونوں باتوں کو سنت ہونا چاہیے، اب بحث صرف ترجیح میں رہ جاتی ہے، اللہ تعالیٰ ہی آغاز و انجام میں راہ راست کی توفیق دینے والا ہے۔

پھر مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تلمذ سے ہمارے شیخ عدل، حجۃ، مسند وقت مولانا محمود حسن نے علوم کی تکمیل کی، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان کے فیوض سے مستفیض فرمائے،

وہی اس وقت مدرسہ کے صدر مدرس ہیں، اس ملک میں ان ہی کی اسناد پر مدار ہے، جو خصوصیت اپنے مشائخ کے طریق حق پر قائم ہیں، حق تعالیٰ نے ان کو روایات متعارضہ میں مطابقت پیدا کرنے اور تعارض کو رفع کرنے اور مشکلات حدیث کو حل کرنے کا ملکہ خاص عطا فرمایا ہے۔ بطور مثال ایک واقعہ پیش خدمت ہے، انھوں نے مجھ سے ایک مرتبہ فرمایا کہ کسوف کی نماز میں جو تعدد رکوع احادیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے وہ آپ کے ساتھ خاص ہے، کسی خاص وجہ سے آپ نے ایسا کیا ہے لیکن امت کو آپ نے ایک ہی رکوع کی ہدایت کی ہے چنانچہ فرمایا ہے صلوا کاحدث صلوٰۃ صلیتموہا من المکتوبۃ (جو فرض نماز کہ تم عنقریب پڑھ چکے ہو اس جیسی نماز پڑھو، یعنی صبح کی ایسے ہی کسوف کی نماز پڑھو، میں نے عرض کیا کہ سادات شافعیہ تو اس تشبیہ کو تعدد رکوع پر محمول کرتے ہیں، وہ تعدد رکوع پر نہیں، فرمایا یہ تو بدیہی کہ نظری بناتا ہے، کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سب کی آنکھوں کے سامنے مجمع عام میں کسوف کی نماز متعدد رکوع سے پڑھی اور امت کے لیے تعدد رکوع ہی کو مشروع کرنا تھا تو پھر آپ نے جو صحابہ نے مشاہدہ کیا تھا اس کا حوالہ کیوں چھوڑ دیا اور صبح کی نماز سے تشبیہ کی طرف میلان فرمایا، یہ محض اس لیے کیا کہ آپ نے متعدد رکوع کسی اور عارض کی وجہ سے کیے تھے اور آپ نے امت کو نماز کے مشہور و معروف طریقہ کی طرف ہدایت فرمائی"۔ (ملاحظہ ہو القاسم ج ۳ شمارہ نمبر ۲ سنہ ۱۳۳۰ھ دیوبند، ص ۲۹۔۳۲)

اس تقریر سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بزرگان دیوبند نے جس طرح فقہ حدیث سے خصوصی اعتنا کیا اسی طرح اس فن کے مشکلات کے حل کرنے پر بھی خاص توجہ کی ہے، سید انور شاہ نے یہ کام بہ وجوہ پایہ تکمیل کو پہنچایا

(باقی)

امام العصر علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ

از

جناب مولانا عبدالحلیم صاحب چشتی، ایم-اے، فاضل دیوبند

(۲)

درس حدیث میں تجدیدی کارنامہ | علامۂ موصوف درس میں کتاب ہی نہیں پڑھاتے بلکہ علوم کا درس دیتے تھے جس سے طلبہ کے ذہن میں جلا، نظر میں وسعت اور معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوتا تھا اور انھیں اپنی پڑھی ہوئی چیزوں سے کام لینے کا ڈھنگ آتا تھا اور اس حیثیت سے طلبہ کے لیے یہ درس بڑی افادیت کا حامل تھا اور ان کے معراج کمال کے لیے یہ بھی کچھ کم نہ تھا لیکن درس حدیث میں علامہ موصوف کا تجدیدی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے حدیث کی شرح میں ہر فن کا اجرا کیا او جس طرح علامہ شرف الدین طیبی شافعی المتوفی ۷۴۳ھ نے احادیث کی شرح میں فقہ حدیث کے فن کو برتا اور فن بلاغت کے اسرار و معارف اور لغت و کلام کے نکات کو سمجھایا اور ان فنون کو شرح حدیث میں جاری کرکے دکھایا ہے، اسی طرح علامہ سید انور شاہؒ نے درس حدیث میں تمام متداول علوم وفنون کو حدیث کی شرح میں برتا اور ان کے اجرا کا طریقہ اور سلیقہ سکھایا ہے، اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوجاتی ہے کہ مغز حدیث تک رسائی کے لیے جملہ علوم میں درشگاہ ضروری ہے، اس درس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ علامہ نے اس میں مشکلات علوم کو حل کیا ہے، اور فن کی دقیق باتوں کو سمجھایا ہے، ہندوستان اور پاکستان ایسے بہت سے جید علماء

گزرے ہیں جن کے حواشی و شروح نے مشکل سے مشکل کتاب کو پانی کر دیا ہے اور ان سے استفادہ آج آسان ہوگیا ہے، لیکن ایسے علما جنھوں نے کسی خاص فن کے مشکلات کو حل کیا ہو خال خال ہی ہیں، صرف علامہ سید انور شاہ کے متعلق یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اسلامی علوم کے مشکلات کو موصوف ہی نے سب سے زیادہ حل کیا ہے، ان وجوہ سے ان کے درس کی تقریروں (امالی) میں جو تنوع پایا جاتا ہے وہ امالی کی علمی دنیا میں اور کہیں نہیں ملتا، تفسیر، حدیث، فقہ، لغت، ادب اور نحو کی متعدد امالی زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں اور یہ سب ائمۂ فن کی امالی ہیں، اور بعض امالی تو ایسے ائمۂ فن کی ہیں جن کو بعض علوم میں اجتہاد کا دعوی ہے، مگر ان میں سے کسی میں اس نوع کا تنوع اور ہمہ گیری نہیں ہے، فقہ کی امالی میں فقہی مسائل ہی سے بحث ہے اور لغت کی امالی کا دائرہ شعر و ادب تک محدود ہے، نحو کی امالی کا تعلق نحوی مسائل سے ہے، علامہ سید انور شاہ کی امالی میں ہر فن سے اعتنا ہے اور اس کے مشکلات کو حل کیا گیا ہے، اس لیے اس میں تنوع پایا جاتا ہے، اور اس کی حیثیت دائرۃ المعارف کی ہوگئی ہے، اس بنا پر یہ کہنا بیجا نہیں کہ علامہ موصوف کو اگرچہ نہایت محنتی اور ذکی تلامذہ ملے جنھوں نے اپنی استعداد کے مطابق ان کے درس کی تقریروں کو بڑی محنت اور جانفشانی سے قلمبند کیا، اور ان کے علوم نے علمی دنیا کو متعارف کرایا، جو ان کا ناقابل فراموش علمی احسان ہے،

ضبط امالی کے صفات اربعہ

لیکن حقیقت یہ ہے کہ علامۂ موصوف کے علوم کو قید تحریر میں لانے کے لئے محض ذکاوت و محنت ہی کافی نہ تھی، بلکہ علوم و فنون میں تبحر اور وسعت نظر بھی درکار تھی، جو ان صفات اربعہ سے آراستہ ہوتا وہی اُن کے درس سے پورا پورا استفادہ کرسکتا اور اُن کی درس کی تقریروں کو اچھی طرح قید تحریر میں لاسکتا تھا، اس مقصد پر علامہ سید انور شاہ کے درس کے متعلق بیساختہ وہ فقرہ زبان قلم پر جاری ہوجاتا ہے، جو علامہ محقق کمال الدین ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ نے علامۃ الدہر شیخ محمد بن محمد المشدالی المتوفی ۸۶۲ھ کے درس کے متعلق کہا تھا کہ

هذا الرجل لا ينتفع بكلامه
لا ينبغي ان يحضر درسه
الا حذاق العلماء[1]

اس مرد کامل کی باتوں سے ماہر فن
علما ہی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، اور
ان ہی کو اس کے درس میں حاضر
ہونا سزاوار اور لائق بھی ہے،

علامہ سید انور شاہؒ کے تلامذہ کو علوم میں وہ حذاقت و مہارت حاصل نہ تھی، جس سے وہ امام عصر کی درسی تقریروں کو اچھی طرح سمجھ سکتے، اور قید تحریر میں لا سکتے، دوران مطالعہ میں امام عصر کی امالی میں کہیں کہیں جو بعض موٹی موٹی غلطیاں نظر آجاتی ہیں، وہ اسی کا نتیجہ ہیں کہ اس اہم کام سے عہدہ برآ ہونا اُن کے تلامذہ کے بس کا کام نہ تھا، مجھے اس کا اندازہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی امالی صحیح مسلم کے دیکھنے سے ہوا، جو انھوں نے مسلم شریف کے سبق میں علامۂ موصوف سے حسن کر قلم بند کی تھیں، حالانکہ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے علوم کی تحصیل اس دور کے ارباب کمال سے کی تھی، اور فقہ، منطق، فلسفہ، اصول، اور کلام وغیرہ کی چوٹی کی کتابیں ان اساتذہ سے پڑھی تھیں، جن کے درس کی ہندوستان میں بڑی دھوم تھی، لیکن انھوں نے جیسی کچھ درسی تقریریں سمجھی اور لکھی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ ایسے محنتی اور ذکی طالب علم بھی امام عصر کی پوری باتیں سمجھ نہیں پاتے تھے، چنانچہ انھوں نے اپنے عجز کا اعتراف امالی صحیح مسلم[2] میں کیا ہے، اور جس مقام پر جو بات سمجھ میں

---

[1] ملاحظہ ہو البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع از قاضی محمد شوکانی، طبع قاہرہ ج ۲ ص ۲۴۸ [2] امالی صحیح مسلم کا یہ مجموعہ کسی طرح علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

نہیں آئی ہے، وہاں نقطے ڈال دیئے ہیں، علامۂ موصوف کے علوم کی عظمت اُن کے دل و دماغ میں ایسی بیٹھی ہوئی تھی کہ یہ امالی اُن کو جان سے زیادہ عزیز تھی، اس کے گم ہو جانے کا ان کو ساری عمر افسوس رہا، اور وہ اس کی گم شدگی پر بڑی حیرت سے یہ شعر جس کو مجدد الف ثانیؒ اپنے مکتوبات میں بکثرت نقل کرتے ہیں، پڑھتے تھے،

آنچہ از من گم شدہ گر از سلیماں گم شدی
ہم سلیماں ہم پری ہم اہرمن بگریستے

علامہ سید انور شاہؒ کے تلامذہ کا اُن کے علوم کو کما حقہٗ مدوّن نہ کر سکنے پر بھی امام شافعیؒ کا وہ قول یاد آتا ہے، جو انھوں نے امام مالکؒ کے معاصر امام لیثؒ بن سعد المتوفی ۱۷۵ھ کے متعلق فرمایا تھا، امام شافعیؒ کا قول یہ ہے،

اللیث افقه من مالك الّا ان اصحابه ضیّعه،	امام لیث امام مالک سے زیادہ فقیہ تھے، لیکن امام لیث کے شاگردوں نے ان کو ضائع کر دیا،

حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تشریح یہ کی ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۱) کے ہاتھ آگیا تھا، موصوف نے فتح الملہم بشرح صحیح مسلم میں اس سے استفادہ کیا، اور امالی کا حوالہ بھی دیا ہے، (ملاحظہ ہو فتح الملہم، ج ۳ ص ۳۲۳) لیکن معلوم نہیں کیوں جامع امالی مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے نام لینے سے گریز کیا،

ہمیں مولانا محمد یوسف صاحب بنوری زید مجدہم کے توسط سے یہ مجموعہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے چھوٹے بھائی فضل احمد عثمانی سے دیکھنے کے لئے ملا تھا، گو یہ مجموعہ زیادہ ضخیم نہیں، مگر علامہ سید انور شاہ کے علوم کا آئینہ دار اور بہت سے علمی فوائد کا حامل ہے،

یعنی لم یدونوا فقهه کما دونوا فقه مالك وغیره وان کان بعضهم قد جمع منها شیئًا[1]	امام شافعیؒ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ امام لیث کے شاگردوں نے اُن کی فقہ کو مدوّن نہیں کیا، جس طرح امام مالک وغیرہ کی فقہ کو شاگردوں نے مدوّن کیا ہے، گو بعض تلامذہ نے اُن کے کچھ مسائل فقہیہ کو جمع کیا ہے (لیکن وہ کوئی قابلِ ذکر کارنامہ نہیں ہے)

یہی صورت علامہ سید انور شاہؒ کے ساتھ پیش آئی، اُن کے شاگردوں نے اُن کے علوم کو مدوّن نہ کر کے اُن کو ضائع کر دیا، آج اُن کی جو امالی ہم کو ملتی ہیں وہ، اُن کے علوم کا ایک شمہ ہیں، اور یہ بھی وہ باتیں ہیں جو اُن کے شاگردوں نے اپنی فہم و بصیرت کے مطابق لکھ لی تھیں، اور علامہ نے بھی طلبہ کی استعداد کے پیش نظر بغیر طلب عام واقفیت کے لئے بیان کر دی تھیں، اگر سائل محقق ہوتا، اور سوالات بھی علمی کرتا، تو امالی کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا، کاش سید انور شاہ کو بھی کوئی ایسا شاگرد مل گیا ہوتا، جیسے حافظ ابن حجر عسقلانی کو حافظ شمس الدین محمد بن عبدالرحمن سخاوی المتوفی ۹۰۲ھ ملے تھے، کہ جب جی چاہا تقریر ضبط کرانے کے لئے خادم کو بھیج کر بلا لیا، یا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی طرح انھیں بھی کوئی محمد عاشق پھلتی مل گیا ہوتا، جو باصرار اُن سے اُن کے علوم کو مدوّن کراتا، تو علمی دنیا اُن کی امالی کو دیکھ کر دنگ رہ جاتی،

علامہ سید انور شاہ کی امالی کو قید تحریر میں لانے کے لئے موزوں ترین شخصیت علامہ شبیر احمد عثمانی

[1] ملاحظہ ہو الرحمۃ الغیثیہ بالترجمۃ اللیثیہ فی مناقب سیدنا الامام اللیث بن سعد از ابن حجر عسقلانی طبع بریہ بولاق مصر ۱۳۰۱ھ ص ۹

کی تھی، وہ بڑے ذہین، طبّاع، اور علوم معقول و منقول میں حاذق تھے، انھیں افہام وتفہیم کا بڑا اچھا سلیقہ تھا، زوربیان اور حُسن ترتیب کا بھی ملکہ تھا، عربی تحریر وتقریر پر بھی پوری قدرت حاصل تھی، علامہ سید انور شاہؒ کو بھی اُن کے فہم و فراست پر پورا اعتماد تھا، اور یہ بھی علامۂ موصوف کی جامعیت، ژرف نگاہی اور وسعت معلومات کے قائل اور قدر دان تھے، اسی لئے فتح الملہم شرح صحیح مسلم میں جگہ جگہ ائمۂ فن اور کبار علماء کے اقوال کے ساتھ علامہ سید انور شاہؒ کے اقوال کو بھی زیب قرطاس کیا ہے،

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے صحیح مسلم کی شرح میں بڑی محنت کی، اپنی پوری جوانی اس میں لگا دی تھی، پھر بھی وہ پوری نہ ہو سکی، قرآن مجید پر اردو میں حواشی اور تفسیر ان کا بڑا کارنامہ ہے جس کے لئے آئندہ نسلیں اُن کی ممنون ہوں گی، لیکن اُن کے مرتبہ کا کام یہ تھا کہ وہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی کتابوں کے مضامین اپنی زبان میں بیان کر جاتے تو عوام و خواص دونوں ان سے استفادہ کر سکتے، یا علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کی صحاح ستہ پر امالی (درسی تقریروں) کو قید تحریر میں لے آتے، تو یہ علمی دنیا پر ان کا بہت بڑا احسان ہوتا، اور اُن کی بقا کے لئے اور کسی چیز کی ضرورت نہ ہوتی، لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے یہ کام نہیں کیا، اُن کے مقابلہ میں سید انور شاہؒ نے اپنی فطری صلاحیتوں سے وہی کام لیا، جو ان کے دل و دماغ کا اچھے سے اچھا مصرف ہو سکتا تھا، ان کی اس دماغی فوقیت کا راز یہ ہے کہ انھوں نے اپنی قوتوں سے وہ کام لیا، جو اُن کے ہمعصروں کی دسترس سے باہر تھا، علوم قرآن، حدیث، فقہ، اصول، کلام و فلسفہ سے متعلق اپنی تالیفات اور امالی میں جس قدر مواد یکجا کر دیا ہے، وہ علوم کا گویا نچوڑ ہے،

تاہم علامہ سید انور شاہ کے بعض تلامذہ نے ان کے علوم کو جس قدر اور جس صورت میں

بھی مرتب و مدوّن کر دیا ہے، وہ بھی اہل علم کے لئے بڑا کارآمد اور قیمتی سرمایہ ہے اور آج علامۂ موصوف کے گوناگوں علوم میں تبحر کے معلوم کرنے کا واحد ذریعہ یہی امالی ہیں، گو ایک ہوشمند عالم کو مختلف موضوع پر اُن کے مختصر رسالوں کے مطالعہ سے ان کی جامعیت، جلالت شان، اور ہر فن میں مجتہدانہ بصیرت کا بخوبی علم ہو جاتا ہے، لیکن جو تنوع اُن کی امالی میں ہے، وہ تالیفات میں نہیں، کیونکہ اُن کے موضوع خاص ہیں، جن کی بحث کے گوشے بھی مخصوص اور محدود ہوتے ہیں، اس کے برعکس درس کے حدود نہایت وسیع ہیں، اس میں بہت سے مسائل زیر بحث آجاتے ہیں،

علامہ سید انور شاہؒ کی امالی اگرچہ پوری صحاح ستہ پر ہیں، لیکن العرف الشذی علی جامع الترمذی، فیض الباری علی صحیح البخاری اور معارف السنن جس میں علامہ موصوف کے مشکلات علوم کی توضیح و تشریح کی ہے، امالی علی صحیح مسلم، امالی علی سنن ابی داؤد، امالی علی سنن ابن ماجہ زیادہ اہم ہیں، اول الذکر تین کتابیں، اپنی نوعیت کے اعتبار سے ہندوستان کی سرزمین پر پہلی اور آخری ہیں، ہندوپاک میں علوم سے معمور ایسی مفید اور جامع کتابیں کبھی نہیں لکھی گئیں، میں جب ان امالی کو دیکھتا ہوں تو استاد اور شاگرد دونوں کو دعائیں دیتا ہوں۔

ان امالی میں علامہ سید انور شاہؒ نے اس زمانہ میں حنفی مذہب کو حدیث کی بنیاد پر جس طرح مستحکم کیا ہے، وہ حقیقت میں اُن کا بڑا کارنامہ ہے، اکثر مواقع پر علامۂ موصوف کی دقت نظر اور علوم و فنون میں حذاقت ان کو متقدمین کی صف میں بھی ممتاز و نمایاں کر دیتی ہے، ذٰلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء پھر کمال یہ ہے کہ اُن کی تنقید کے الفاظ میں ایسی احتیاط ہے کہ ادب کا پہلو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ موصوف باینہمہ علم و فضل اخلاق و تقویٰ کے کیسے بلند مقام پر فائز تھے،

اکابر دیوبند کے کمالات کے جانچنے کا معیار

اکابر دیوبند میں محقق عارف باللہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، امام سُنّت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس اللہ اسرارہم کے علمی و عملی کمال کے جانچنے کا جو صحیح ترین معیار ہے، بحمد اللہ اس معیار پر علامہ سید انور شاہ کشمیری پورے اترتے ہیں، یہ حقیقت پسندانہ معیار بھی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نے بتا دیا ہے، فرماتے ہیں:

"لوگ کہتے ہیں کہ رازی اور غزالی پیدا ہونا بند ہو گئے، مگر بالکل غلط ہے، ہمارے حضرات رازی اور غزالی سے کم نہ تھے، علوم میں بھی کمال میں بھی،

بات یہ ہے کہ حیات میں قدر نہیں ہوتی، مرجانے کے بعد رحمۃ اللہ علیہ اور پچاس برس گذر جانے کے بعد قدس سرہ ہو جاتے ہیں، اور مماثل کے معلوم ہونے کا بڑا اچھا معیار ہے، اُن کی تحقیقات کو بھی دیکھ لیا جائے، اور ان حضرات کی بھی، اس سے معلوم ہو جائے گا[1]

عارف تھانویؒ حسن العزیز میں فرماتے ہیں،،

ان حضرات کی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کرا دیا جائے، اور بتلایا جائے تو دیکھنے والے رازی و غزالی کے زمانہ کی تبلادیں گے[2]،،

جس کو اس امر میں تامل ہو وہ علامہ موصوف کی تصانیف کا موازنہ قدماء کی تصانیف سے کرکے دیکھ لے حقیقت آشکارا ہو جائے گی، مثلاً تکفیر کے موضوع پر جن ائمہ فن نے قلم

[1] ملاحظہ ہو: الافاضات الیومیہ من الافادات القومیہ طبع کراچی ج ۲ ص ۲۹۹ و ۳۰۰

[2] ملاحظہ ہو حسن العزیز (ملفوظات حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی) شائع کردہ مکتبہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون، بھارت ج ۲ ص ۳۰۴،

اٹھایا، اُن میں حجۃ الاسلام امام غزالی، ابن حزم، ابن تیمیہ، ابن قیم وغیرہ کا نام سرفہرست ہے، لیکن جیسی جامعیت استیعاب مباحث اور تنقیح مناط علامہ سید انور شاہؒ کے رسالہ اکفار الملحدین فی ضروریات الدین (مجلس علمی ڈابھیل سورت) میں ہے، ان ائمہ کے یہاں نہیں، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارا دعویٰ کس حد تک صداقت پر مبنی ہے،

علامہ موصوف نے اپنی خداداد فہم و فراست اور ذکاوت و بصیرت سے اپنے رسائل اور امالی میں مشکلاتِ علوم کو جس طرح حل کیا ہے، ان کو بلحاظ جامعیت، وسعتِ نظر، عالمانہ ذوق اور کمالِ فن بڑے بڑے اہل کمال ائمہ کی تحقیقات کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے، اس کی توضیح سے یہ مضمون کتاب بن جائے گا، اس لئے ہم اس کی چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں،

کتاب الایمان کی معرکۃ الآرا بحث "الایمان یزید وینقص" میں علامہ شبیر احمد عثمانی نے فتح الملہم میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی المتوفی ۶۳۸ھ، شیخ عبد الوہاب شعرانی المتوفی ۹۷۳ھ اور علامہ ابو محمد علی بن حزم المتوفی ۴۵۶ھ کا قول پیش کرنے کے بعد علامہ سید انور شاہ کا قول نقل کیا ہے[1]

اس مسئلہ پر کہ کفار بھی معاملات میں مخاطب ہیں، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فتح الملہم میں حافظ ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ اور علامہ بدر الدین عینی کا کلام نقل کرنے کے بعد حافظ سید انور شاہؒ کا فیصلہ نقل کیا ہے[2]

نزولِ عیسیٰ کی بحث میں علامہ عثمانیؒ نے فتح الملہم میں سید انور شاہ کی پُرمغز بحث کو بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے[3]

اسی طرح معراج کے باب میں آیتِ شریفہ ولقد راٰہ نزلۃ اخریٰ کی توضیح

[1] ملاحظہ ہو فتح الملہم بشرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۵۹ [2] ایضاً ص ۱۸۷ [3] ایضاً ص ۳۰۱،

وتشریح اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدارِ الٰہی کی بحث میں علامہ عثمانیؒ نے صرف علامہ سید انور شاہؒ کے کلام کو نقل کیا ہے، اور کسی اور محقق کے کلام کو پیش کرنے کی حاجت نہیں سمجھی ہے[۱]۔

حدیث شریف نور انّی اراہُ کی تشریح میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فتح الملہم میں مشہور شارح بخاری شیخ ابو عبداللہ محمد بن علی مازری مالکی المتوفی ۵۳۶ھ کا قول نقل کرنے کے بعد سید انور شاہ کا قول پیش کیا ہے، پھر یہ لکھا ہے، ولا یخفی ما فیہ من اللطافۃ[۲]،

اسی طرح مسح ربع راس (چوتھائی سر کے مسح کی فرضیت) کی بحث میں علامہ عثمانیؒ نے فقیہ ابوالولید محمد بن رشد مالکی المتوفی ۵۹۵ھ اور محقق کمال الدین ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ وغیرہ کی بحث کے بعد علامہ سید انور شاہ کا نقطۂ نظر پیش کیا ہے[۳]،

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے وضو میں سات مرتبہ پاؤں دھونے کے متعلق حافظ ابو زکریا محی الدین نووی المتوفی ۶۷۶ھ کا کلام نقل کرنے کے بعد علامہ عثمانیؒ نے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کی توجیہ پیش کی ہے، اور علامہ سید انور شاہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا جو مستدل پیش کیا ہے، وہ نقل کیا ہے، یہ مستدل ان دونوں حفاظِ حدیث کی نظر میں نہیں آیا[۴]،

علامہ موصوف کی تحقیقات کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ حق تعالیٰ کا فیضان آج بھی اس اُمت پر ویسا ہی جاری وساری ہے، جیسا کہ پہلے تھا، ملا علی قاری المتوفی ۱۰۱۴ھ نے حدیث ان اللہ یبعث علیٰ راس کل مائۃ من یجدد لھا دینھا پر بحث کرتے ہوئے جو یہ لکھا ہے،

اِنّ ھٰذا التجدید امر اضافی	یہ تجدید ایک امر اضافی ہے، کیونکہ

۱ ملاحظہ ہو فتح الملہم بشرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۳۵ ۲ ایضاً ص ۳۴۱ ۳ ایضاً ص ۲۹۰؛
۴ ملاحظہ ہو فتح الملہم بشرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۹۳،

لانّ العلم کل سنۃ فی التنزّل	علم سال بسال گھٹتا جارہا ہے،
کما انّ الجھل کلّ عام فی	جہل بڑھتا جارہا ہے، ہمارے دور
الترقی وانما یحصل ترقی علمأ	کے علماء کی ترقی ہمارے علم کے تنزل
زماننا بسبب تنزّل العلم	کے سبب سے ہے، ورنہ متقدمین اور
فی اواننا والا فلا مناسبۃ	متاخرین علماء میں علم وعمل، حلم و
بین المتقدمین والمتاخرین	فضل اور تحقیق وتدقیق کے اعتبار سے
علما وعملا وحلما وفضلاً	کوئی مناسبت ہے،
وتحقیقا وتدقیقاً[۱]،	

یہ کوئی حکم کلی نہیں ہے، متاخرین علماء میں جو ارباب کمال اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، ان میں علامہ سید انور شاہؒ بھی داخل ہیں، سچ ہے،

ہنوز آں ابر رحمت درفشان است	خم وخمخانہ با مہر ونشان است
نقصان نہ قابل است وگرنہ علی الدوام	فیضِ سعادتش ہمہ کس را برابر است

موصوف کی علامہ سید انور شاہ کے الفاظ سے شہرت کی وجہ

علامہ سید انور شاہ کشمیری اکثر ایسی اونچی بات کہتے ہیں جس کو بغیر تمہید وترتیب مقدمات طلبہ کو سمجھانا مشکل ہوتا ہے، اس امر کا صحیح اندازہ ایک مدرس مزاج انسان ہی کرسکتا ہے، جس طرح علمی دنیا میں دقتِ نظر، علوم عقلیہ میں مہارت، اور جلالتِ علمی کی وجہ سے علی بن محمد جرجانی المتوفی ۸۱۶ھ کو علامہ سید شریف جرجانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اسی طرح محمد انور شاہ کو اہلِ علم کے طبقہ میں علامہ سید انور شاہ کے نام سے پکارا جاتا ہے،

۱ ملاحظہ ہو مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح از ملا علی قاری مطبوعہ میمنہ مصر ۱۳۰۹ھ ج ۱ ص ۲۴۸،

جن اہلِ علم نے اس خوانِ علم کی زلہ ربائی کی وہ آسمانِ علم کے درخشاں ستارے بنے اور اس عہد کے اکابر علماء میں ان کا شمار ہوا، ان میں جو وسعتِ نظر پیدا ہوئی وہ علامہ سید انور شاہ کے حلقۂ درس کا فیضان ہے، ایسے ہی نامور تلامذہ کو مولانا سید سلیمان ندوی نے دائرۂ علم سے تعبیر کیا ہے، یاد رفتگاں میں لکھتے ہیں:

"بعض مشاہیر کے نام جو مجھے معلوم ہیں وہ یادگار کے طور پر سپردِ قلم کرتا ہوں، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا ابو المآثر محمد حبیب الرحمان اعظمی مئو، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی، مولانا محمد یوسف صاحب بنوری، ان میں سے ہر ایک بجائے خود دائرۂ علم ہے[۵۱]،

شکل پسندی اور مختصر نگاری

حقیقت و صداقت، عقیدت و محبت سے بلند ہے، اس لئے علامہ انور شاہ کے کمالات کے ساتھ اس کا بھی اعتراف ہے کہ اُن کی طبیعت میں شکل پسندی اور مختصر نگاری تھی، اس لئے اُن کی تحریر و تقریر کو عوام کیا خواص کے لئے سمجھنا بھی مشکل ہے، اُن کی تقریر کے متعلق حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے، فرماتے ہیں:-

"وہاں (شملہ) کے بعض معززین تعلیم یافتہ صاحبوں نے مولانا انور شاہ صاحب سے کہ وہ بھی اسی سفر میں تھے، اعجاز القرآن پر بیان کرنے کی فرمائش کی، چنانچہ بیان کیا گیا، مضمون غامض تھا، وہ لوگ بھی نہیں سمجھے، پھر ان پر اعتراض کیا گیا کہ ایسے بیان سے کیا نفع جو سمجھ میں ہی نہیں آیا، یہ بیان تو مدرسۂ دیوبند میں بیٹھ کر کرنا تھا، اس کا جواب بھی وعظ میں میں نے ہی دیا کہ شاہ صاحب نے

[۵۱] ملاحظہ ہو یاد رفتگاں، طبع کراچی ۱۹۵۵ء ص ۴۵۳،

جو ایسا بیان کیا ہے، وہ اضطراراً نہیں کہ سہل بیان پر قادر نہیں، بلکہ ایک مصلحت سے قصداً بیان کیا ہے، اور مصلحت یہ ہے کہ آج کل مدعیانِ علم بہت زیادہ پیدا ہوگئے ہیں، اور اجتہاد کا دروازہ کھل گیا ہے، حتیٰ کہ انگریزی پڑھ پڑھ کر قرآن و حدیث کا اردو ترجمہ دیکھ کر علوم میں دخل دینے لگے ہیں، تو شاہ صاحبؒ نے دکھلا دیا کہ تم اہلِ علم کے کلام کو بھی نہیں سمجھ سکتے، چہ جائیکہ قرآن و حدیث میں اجتہاد کر سکو،

بتلائیے اس بیان سے یہ نفع تھوڑا ہوا کہ تم کو اپنے جہل پر اطلاع ہوگئی، سب شرمندہ ہوگئے، مجھ کو جاہلوں کا علماء پر اعتراض کرنا بھی ناگوار ہوتا ہے، اس لئے بھی یہ جواب دیا گیا"[۵۲]

اسی شکل پسندی اور مختصر نگاری کی بنا پر ان کے قلم سے جو دو چار رسالے نکل گئے ہیں، اُن کو بڑے سے بڑا محقق بار بار مطالعہ کے بغیر پوری طرح نہیں سمجھ سکتا، چنانچہ فاتحہ خلف الامام جیسے پامال موضوع پر جب علامہ نے قلم اُٹھایا، تو ایسا رسالہ لکھا کہ اہلِ علم کو اشتہار میں یہ لکھنا پڑا کہ بڑے بڑے علماء اس کو مشکل سے سمجھ سکتے ہیں، اس لئے معمولی استعداد کے لوگ اس کو طلب کرنے کی زحمت نہ کریں،

یہ عجیب و غریب اشتہار، مولانا سید اصغر حسین دیوبندی نے کلیات شیخ الہندؒ کے سرورق کی پشت پر دیا تھا کہ:

"فصل الخطاب فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں محدثانہ تحقیقات اور عالمانہ

[۵۲] ملاحظہ ہو الاضافات الیومیہ من الافادات القومیہ طبع تھانہ بھون ۱۳۶۱ھ ج-۶ ص ۱۶۶،

مضامین کا فی الحقیقت بے مثل رسالہ جو اکابر محدثین کی تصنیفات کا سچا نمونہ ہے دار العلوم دیوبند کے صدر مدرس حضرت مولانا انور شاہ صاحب نے عربی زبان میں بکمال انصاف تحریر فرمایا ہے، بڑے بڑے علماء بھی مشکل سے سمجھتے ہیں، کم استعداد مولوی طلب نہ فرمادیں"[1]

علامہ سید انور شاہ میں اگر تصنیف و تالیف کا اچھا سلیقہ ہوتا، اور ان میں مشکل پسندی، ایجاز، اور مختصر نگاری نہ ہوتی، اور اُن کو اپنے معاصر محدث ناقد شیخ محمد زاہد کوثری کا پیرائہ بیان و ترتیب و تہذیب مل جاتی، اور یہ کام اُن کے ہاتھوں انجام پاتا، تو دنیا میں صحاح ستہ کے سمجھنے کے لیے کسی اور کتاب کی حاجت نہ رہجاتی، اور کسی کو اس پر قلم اٹھانے کی گنجائش باقی نہ رہتی، مگر اُن بے نفسوں کو اخفائے حال میں اتنا اہتمام تھا کہ وہ چاہتے ہی نہ تھے کہ دنیا میں اُن کو عالم کی حیثیت سے پہچانا جائے، بزرگوں کے جبر نے تدریس پر بھی آمادہ کیا، ورنہ اُن کو یہ بھی گوارا نہ تھا،

---

[1] ملاحظہ ہو کلیات شیخ الہند، مطبع قاسمی دیوبند ۱۳۴۰ھ